حصہ دوئم

اخلاقیات

تزکیۂ نفس

تزکیۂ نفس سے مراد اپنی ذات کی نفی کرنا ہے۔ آج حالات ہمیں اس موڑ پر لے آئے ہیں کہ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اپنی حالت بدلنے کا آغاز کہاں سے کریں؟ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں ہماری بھرپور رہنمائی فرمائی ہے۔ تزکیۂ نفس' اپنے آپ کو برائیوں اور برے کاموں سے پاک کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے اس پہلو پر کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ باقی تمام دنیاوی چیزوں کے لیے ہم ہر قسم کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس معاملے کے لیے ہم نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا بہتر سمجھا ہے۔ کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور کلمہ گو ہیں لہٰذا ہم معاف کر دیئے جائیں گے۔

یعنی بے شمار برائیاں جیسے بداخلاقی' جھوٹ' بے ایمانی' غیبت' منافقت' دوسروں کی تحقیر' حسد' بغض وعناد' بے حسی' ظلم' لوٹ مار' چور بازاری' خودغرضی' غرور وتکبر اور لالچ وغیرہ جن کی وجہ سے ہمیں نہ تو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھنے کا حق پہنچتا ہے اور نہ ہی یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ ایسی بُرائیوں کے ڈھیر بن کر ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر اپنے لئے بخشش کے امیدوار ہو سکتے ہیں' ہمیں شاید اشرف المخلوقات کہلانے کا بھی حق نہیں پہنچتا۔ ان سب برائیوں کو دلوں میں لیے ہم اللہ تعالیٰ سے بخشش کے امیدوار کیسے ہو سکتے ہیں؟ کیا ایسے نفس کو ملامت نہیں کرنا چاہیئے؟ کیا ہمیں بھرپور کوشش نہیں کرنی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم اپنے آپ کو ان منفی اور قابل نفرت جذبات سے پاک صاف کریں؟ کیا ہم اس بھول میں ہیں کہ خدا ایسے انسانوں چاہے وہ جیسے بھی ہوں قبول کر لے گا؟ ان کے سب جرائم اور گناہوں کو معاف کر دے گا؟ کیا اللہ ان کی تمام بداعمالیوں اور کرتوتوں کو معاف کر دے گا جن کی وجہ سے آج معاشرے میں وہ روایات تشکیل پا رہی ہیں اور وہ ناانصافیاں ہو رہی ہیں جن کے نتائج تباہ کن ہیں؟ کیا اللہ ان ظالموں کو سزا نہیں دے گا جن کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ حق تلفیاں ہو رہی ہیں اور معاشرے میں بے چینی' اضطراب اور بگاڑ پیدا ہو رہا ہے؟ کیا اللہ ان لوگوں کو ایسے ہی چھوڑ دے گا جنہوں نے اس کائنات میں مسائل کے ڈھیر لگا دیے ہیں؟ یقیناً نہیں! اللہ تعالیٰ ہمیں اس وقت قبول کرے گا اور قابلِ بخشش سمجھے گا جب ہمارے دل میں کسی بھی انسان کے لیے بغض وعناد' نفرت' حسد' حقارت کے جذبات نہیں ہوں گے' جب ہمارے دل اللہ اور رسول کی محبت سے سرشار ہوں گے اور ہمارے دل عجز وانکساری اور نرمی کے جذبات سے معمور ہوں گے۔

قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے کہ :

'' قسم انسان کی اور اس کی جس نے اس کے اعضاء کو برابر کیا۔ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی۔ کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا۔ اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔ '' (91: 7-10)

انسان کے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن خود اُس کے اپنے اندر موجود ہے۔ وجود کا حصہ ہونے کے باوجود بھی ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ دشمن کون ہے وہ دشمن ہے ہمارا اپنا نفس۔ وہ نفس جس کے تابع ہم ہو چکے ہیں اور جو ہمیں اچھائی یا برائی پر راغب کرتا ہے اور اگر اسے قابو میں نہ رکھا جائے تو شتر بے مہار کی طرح آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور بغیر سوچے سمجھے صرف اپنے فائدے کے لیے اچھے یا برے کی تمیز کئے بغیر انجانی راہوں پر چل نکلتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے نفس سے زیادہ عقلمند اور کوئی نہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کو قابو میں نہ رکھا جائے تو اس سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔

ہم یہ نہیں سوچتے کہ ہر گزرنے والا لمحہ ہمیں موت کی طرف دھکیلتا چلا جا رہا ہے۔ آج ہو یا کل موت کا کوئی وقت معین نہیں۔ اس وقت ساری انسانی خواہشات دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی ہمیں کم ہی فکر ہوتی ہے کہ اپنے نفس کو برائیوں سے پاک کریں۔

قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے کہ :

'' قریب آ گیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں ان کے پاس جو تازہ نصیحت بھی ان کے رب کی طرف سے آتی ہے اس کو یہ تکلیف سے سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں۔ دل ان کے (دوسری ہی فکروں میں) منہمک ہیں۔'' (21:1-3)

ہمارا نفس شاید اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے کہ چاہے ہم جو مرضی کر لیں دوسروں کے ساتھ کیسی بھی زیادتی کیوں نہ کر ڈالیں، اللہ کے احکامات کی کتنی ہی نافرمانیاں کیوں نہ کر ڈالیں اللہ پھر بھی ہمیں بخش دے گا۔ ہم خود اپنی دنیا سنوارنے میں لگے ہیں اور اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا کر دنیا میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنا اچھا برا جاننے کے باوجود ہمارا نفس اپنی مرضی کے راستے پر ہی چلنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی ڈاکٹر ہمیں کسی غذا کو کھانے سے منع کرے کہ یہ صحت کے لیے تباہ کن ہے تو ہم اس کھانے کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیں گے مگر ہم وہ برے اعمال نہیں چھوڑتے جو ہمارے نفس کو بُرائی کی طرف مائل کر رہے ہیں۔

کبھی ہمیں خیال ہوتا ہے کہ ابھی تو بہت عمر پڑی ہے اور عمر کے آخری حصے میں اپنی آخرت کو سنوار لیں گے۔

یہ ہماری بہت بڑی غلط فہمی ہے کیونکہ وقت اتنی تیزی سے گزر رہا ہے کہ اگلی سانس پر بھی اعتبار نہیں کہ آئے یا نہیں۔ جب زندگی کی اگلی سانس کا بھی نہیں پتہ تو آخرت کو ہم کیوں داؤ پر لگا رہے ہیں۔ بے اعتبار زندگی کا کیا بھروسہ کہ کیا پتہ کب وقت آئے اور ہم منوں مٹی کے ڈھیر تلے دب جائیں اور مرتے وقت ملامت ہی ہوگی کہ کچھ نہیں کیا۔

سوچا جائے تو خواہشات کی کوئی حد نہیں' انہیں پورا کرنے میں عمر بھی گزر جائے تو بھی کم ہی لگے گی۔ اگر شروع میں ہی انہیں اکھاڑ کر پھینک نہ دیا جائے تو وقت کے ساتھ ساتھ اس کی جڑیں مضبوط ہوتی جائیں گی اور آخر کار نفس کے ہاتھوں ذلت وخواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ :

'' عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کو مطیع کرے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے اور احمق وہ ہے جس کا نفس اپنی خواہشات کی پیروی کرے اور اللہ سے امیدیں باندھے۔ '' (مشکوٰۃ' ابنِ ماجہ)

ہم شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں ایک مسافر کی طرح ہیں خالی ہاتھ یہاں آئے ہیں اور خالی ہاتھ ہی جائیں گے۔ سوائے اعمال نامہ کے ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوگا۔ دنیا میں بے شمار مثالیں ہیں کہ جن لوگوں نے بھی مال و دولت اور عیش وعشرت میں زندگی گزاری مرتے وقت ان کے ہاتھ بھی اسی طرح خالی تھے جس طرح بھکاری کا کاسہ ہوتا ہے۔ اس لیے اپنے نفس کو بار بار ڈانٹ ڈپٹ کر سیدھے راستے پر لانا بہت ضروری ہے کیونکہ نفس بہت جلدی شیطانی بہلاؤں میں آ جاتا ہے اور بھٹکنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس بیماری سے بچنے کی سخت تلقین کی ہے اور جگہ جگہ قرآن پاک میں واضح کیا ہے کہ انسان کس طرح اس بیماری کا شکار ہو کر اپنے لیے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر سکتا ہے۔

'' سو کیا آپ نے اس شخص کی بھی حالت دیکھی ہے جس نے اپنی خواہشِ نفسانی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے اور اللہ نے اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے۔ اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگا دی۔ اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ سو ایسے کو اللہ کے بعد اور کون ہدایت کرے؟ تو کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے؟ '' (45:23)

'' اور اگر آپ اس علم کے بعد جو آپ کو پہنچ چکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگے تو آپ کے لیے اللہ (کی گرفت) کے مقابلہ میں نہ کوئی یار ہوگا نہ مددگار۔ '' (2:120)

'' سو (اے داؤد) لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرتے رہیے اور (آئندہ بھی) نفسانی

خواہش کی پیروی نہ کیجئے کہ وہ اللہ کے راستہ سے آپ کو ہٹا دیگی۔ '' (38:26)

'' پھر اگر یہ لوگ آپ کا یہ کہنا نہ کرسکیں تو آپ سمجھ لیجئے کہ یہ لوگ محض اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں۔اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو شخص اللہ کی ہدایت کے بغیر محض اپنی خواہش نفسانی پر چلے بیشک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔'' (28:50)

'' تو تم خواہشِ نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑنا۔ '' (4:135)

'' اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں۔پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا۔سو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔اور وہ گمراہوں میں داخل ہوگیا۔اور اگر ہم چاہتے تو ہم اس کا مرتبہ ان (اپنی نشانیوں) کے ذریعہ سے اونچا کر دیتے۔لیکن وہ زمین کی طرف مائل ہو گیا۔اور اپنی خواہشِ نفسانی کی پیروی کرنے لگا۔سو اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر تو اس پر حملہ کرے (جب بھی) ہانپے یا تو اسے چھوڑ دے (جب بھی) وہ ہانپے۔ ''

(7: 175-176)

'' آپ نے اس کی بھی حالت دیکھی ہے جس نے اپنی خواہشوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے؟ کیا آپ اس کے ذمہ دار رہ سکتے ہیں؟ '' (25: 43)

'' اور جو کوئی ڈرا اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے اور اس نے (اپنے) نفس کو (بری) خواہش سے روکا تو ایسے کا ٹھکانہ جنت ہی ہے۔ '' (79: 40-41)

آیئے دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے نفس کو قابو میں کرنے کے لیے کیا اقدامات کر سکتے ہیں۔

- اللہ اور اس کی مخلوق سے محبت کرنا سیکھی جائے۔
- غلطیوں، کوتائیوں اور گناہوں پر نادم ہونا سیکھا جائے۔
- اور دوبارہ ان غلطیوں کو نہ دہرانے کا پختہ عزم کیا جائے۔
- غریبوں، یتیموں اور نادار لوگوں کے ساتھ محبت اور حسن سلوک روا رکھا جائے۔
- اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے اللہ کے آگے اپنی فریاد سنائی جائے۔
- اسی سے رہنمائی طلب کی جائے کیوں کہ صرف وہی فریاد سننے والا اور بخشنے والا ہے۔

وہ غفور الرحیم ہے اور اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔اس کی رحمت وسیع اور اس کا کرم عام ہے۔وہ ہر خطا کو معاف کرنے والا ہے۔اس لیے ہمیں چاہیئے کہ اپنے نفس کو تمام برائیوں سے دور کر کے ہم اس کی بے

پناہ رحمت کے حصار میں آ جائیں اور اس کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ جب بندہ اپنے گناہوں پر نادم ہوتا ہے اور اپنے نفس کو پاک کرنے کے لیے اللہ کے حضور سچے دل سے گڑگڑا کر معافی مانگتا ہے اور آئندہ اپنے آپ کو سیدھے رستے پر چلانے کا عہد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے کی پچھلی سب خطائیں معاف کر کے اپنی خاص نظرِ کرم اور توجہ اس کی جانب مبذول کرتے ہیں اور یوں تزکیہ نفس کے ذریعے ہم اپنے خالق و مالک کی محبت و قربت حاصل کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں اور ہمارے اس سفر کا آغاز ہو جاتا ہے جس کی منزل خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

☆ _____ ☆

سکونِ قلب

ہر ذی ہوش فرد کو اردگرد کے حالات دیکھتے ہوئے سخت تشویش اور دکھ ہوتا ہے۔ بداخلاقی، چوری، قتل وغارت، جرم وزیادتی، رشوت ستانی، سفارش، بے ایمانی، دھوکہ فراڈ، منافقت غرض کہ کونسی برائی ہے جو نظر نہیں آتی۔ سب لوگ ایک دوسرے پر یا معاشرے پر الزام ڈال کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ دراصل ان سب برائیوں کا محور ہماری اپنی ذات ہے۔ یہ ہمارے اپنے دل ہی ہیں جو دشمنی، نفرت اور بغض وعناد سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ ہم ہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں کچھ اور ہے اور زبان پر کچھ اور۔ ہمارے اس رویے کی وجہ سے معاشرے میں ناانصافی ہو رہی ہے، حقداروں کو ان کا حق نہیں مل رہا اور غلط ترجیحات قائم ہو گئی ہیں جس وجہ سے دن بدن جرائم بڑھ رہے ہیں۔ ان سب برائیوں کا خاتمہ تب ہی ہوگا جب ہم اپنے اپنے دلوں میں جھانکیں اور دیکھیں کہ ہمارے دل کا کیا حال ہے۔ کیا یہ دل اس لائق ہے کہ اس کو قلب سلیم کہا جائے۔

قلبِ سلیم کا مطلب ہے سلامتی والا دل۔ یعنی ایسا دل جو کہ سچ کی پہچان کر سکے اور سچ بول سکے، جس میں امن و سلامتی کے جذبات ہوں، جو دوسروں کو امن وآشتی کا پیغام دے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہم کبھی باہر کی دنیا سے الگ اور جسم کے تقاضوں سے لاتعلق ہو کر اپنے دل کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں؟ ہمارے اردگرد اتنے زیادہ ہنگامے ہوتے ہیں اور زندگی اس طرح سے رواں دواں ہے کہ ہماری نظر کہیں ٹھہر ہی نہیں پاتی۔ ہمیں بہت ساری چیزوں میں دلچسپی ہے سوائے اپنے اندر جھانکنے کے۔

روپے پیسے اور عیش وعشرت کے سامان کے تصور نے ہمیں کچھ اس طرح الجھا رکھا ہے کہ ہم اپنی نگاہوں کو بھی اپنے دلوں تک پہنچنے سے روکتے ہیں کیونکہ اس کام کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں۔ لیکن ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قیامت کے دن خبر ہوگی کہ نجات اور کامیابی اصل میں نہ مال و دولت پر ہے نا اچھی قسم کے لباس اور طرزِ زندگی پر، وہاں تو معاملہ بالکل ہی الگ ہوگا۔ جب کہ ایک ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ہی گیا گزرا ہے جس کا دل اللہ کی یاد اور خوف سے غافل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

> ”اور اس شخص کا کہا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔“ (18:28)

جب کہ اس کے برعکس اس شخص کے لیے جو اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد رکھتا ہے فرمایا:

> ”نجات اور کامیابی صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوں گے۔“

(26:89)

آج ہمیں سوچنا چاہیئے کہ کیا قلب سلیم جیسی دولت ہمارے پاس ہے؟ سلامتی والا دل' حق شناس دل اور سچا دل ہے ہم لوگوں کے پاس؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو یاد رہے کہ پھر اس زندگی کی سب سرگرمیاں' سب ہنگامے اور مشغلے سب کچھ بے کار ہے۔ یہ تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ پہلو میں دل زندہ بھی ہے کہ نہیں؟ دل کی تباہی چند چیزوں سے ہوتی ہے۔

☆ ایک یہ کہ جسمانی خواہشات دل کے اردگرد محاصرہ کر لیں اور ساری توجہ دولت اور مال واسباب جمع کرنے کی طرف لگ جائے۔ اس طرح سے دل کے گرد کئی خول چڑھ جاتے ہیں جو آہستہ آہستہ اس کو ختم کرتے جاتے ہیں۔

'' تمہیں غفلت میں رکھا کثرت کی خواہش نے یہاں تک کہ تم نے قبروں کی زیارت کر لی۔ ہرگز نہیں تم عنقریب جان لوگے۔ پھر ہرگز نہیں جلد تم جان لوگے۔ ہرگز نہیں۔ کاش تم علم یقین سے جان لیتے۔ تم ضرور دیکھو گے جہنم کو پھر تم اسے ضرور یقین کی آنکھ سے دیکھو گے۔ پھر تم سے اس دن ضرور پوچھا جائے گا۔ ''

(102:1-8)

☆ دل پر بوجھ کم کیجئے' یعنی خواہشوں اور لذتوں کا بوجھ' روپے پیسے' مال ودولت کی کثرت کا بوجھ' برے اعمال' خیانت' جھوٹ' ریاکاری اور دکھاوے کا بوجھ۔ جب تک یہ بوجھ اتار کر دور پھینک نہیں دیا جاتا دل پر بوجھ بڑھتا جاتا ہے۔ دل کی سلامتی اور سکون اللہ پر ایمان اور اس پر بھروسے سے ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

'' اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں۔ '' (13:28)

☆ ایک دوسرے سے نفرت کرنے اور بغض رکھنے سے دل پر بوجھ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کینہ رکھنے' کسی کی تحقیر کرنے' غیبت کرنے' کسی کے خلاف خوامخواہ محاذ آرائی کرنے اور دوسروں کی غلطیوں کو معاف نہ کرنے سے بھی دلوں پر بوجھ ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ ان سب باتوں سے دل پر آہستہ آہستہ سیاہ نقطے مسلسل لگ رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ ذرا غور کیجئے اپنے باطن کا یہ حال ہو تو چہرے پر کہاں رونق رہ جاتی ہے' اندر کی پستی کا یہ عالم ہو تو ظاہری طور پر آپ کسی اونچے سے اونچے درجے پر بھی پہنچ جائیں تب بھی حقیقی بلندی سے محروم ہی رہیں گے۔

☆ غرض یہ کہ دل کا صحیح ہونا بہت ضروری ہے۔ دل درست ہے تو ساری زندگی صحیح ہے اور اگر دل میں فساد فساد برپا ہے تو ساری زندگی بگڑ جائے گی۔ دل زندہ ہے تو سب کچھ سلامت ہے ورنہ سب کچھ ختم

سمجھئے۔گھٹیا جذبات اور نفرتوں سے بھرے ہوئے دل کو لے کر جب ہم آخرت میں پیش ہوں گے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ قلب سلیم یا اخلاص نیت کے بغیر شاندار سے شاندار عمل بے کار ہے۔ ریاکاری سے کیے گئے کسی کام کی وہاں کوئی اہمیت یا قدر نہیں ہے۔ ہماری نمازیں، تسبیحیں، عبادات، حج اور عمرے، صدقات وخیرات بھی ہمیں وہاں کچھ نہیں دے سکیں گے اگر ہمارا دل اخلاص سے خالی ہوا۔

دل کی ان سب بڑی بیماریوں کا علاج صرف یہ ہے کہ آدمی حال دل کا جائزہ لے اور سوچے کہ اس کے دل پر کن خواہشات اور جذبات کا غلبہ ہے۔ کہیں پیسے کی ہوس نے اسے اندھا تو نہیں کر دیا؟ کہیں آپس میں ناچاقیاں اس قدر تو نہیں بڑھ گئیں کہ دوستوں اور عزیزوں سے تعلق ٹوٹ چکا ہے؟ اپنے خیر خواہوں اور پیاروں کو ناراض کر کے ہم نہ زندگی میں کچھ حاصل کر پاتے ہیں اور نہ ہی آخرت میں۔

اس طرح کے سوالات کو سامنے رکھ کر جب دل کا احتساب کیا جائے تو پھر اصل حقیقت سامنے آ ہی جاتی ہے اور اپنی اصلاح کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

ہمیں چاہیئے کہ اپنے دلوں کو نفرتوں اور کدورتوں سے پاک کر لیں تا کہ ایک پاک صاف دل کے ساتھ جب ہم روز قیامت اپنے پروردگار سے ملیں تو ہمیں اس بات پر شرم نہ آئے کہ اللہ نے ہمیں ایک بہترین دل کے ساتھ دنیا میں بہت سے اچھے کام کرنے کے لیے بھیجا تھا لیکن ہم اس سے کیے گئے وعدے کو پورا نہ کر سکے۔ اس دل کی پاکیزگی اور صفائی کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم ہر قسم کی زبانی اور عملی برائی سے محفوظ رہیں۔ اپنی خطاؤں پر شرمندہ رہیں اور باقاعدگی سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے حضور حاضر ہو کر اپنے گناہوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی طلب کریں اور اپنے دلوں کو حقیقی معنوں میں پرسکونِ قلب بنا لیں۔

☆ ☆

اچھائی اور برائی کا فرق

ہم نے شاید کبھی غور نہ کیا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو' کسی بھی حیثیت یا مرتبے کا ہو' علم و عقل کے لحاظ سے کسی بھی مقام پر ہو اس کی ذات سے یا تو معاشرے میں اچھا اثر پھیلتا ہے یا برا۔ اس کی بات چیت' رویے اور برتاؤ سے یا تو لوگوں میں اچھائی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں یا برائی کی رغبت ہوتی ہے۔ ہم سب کا ایک دائرہ کار ہوتا ہے' ایک محور ہوتا ہے جس کے اردگرد ہماری ذات گھومتی ہے۔ اس دائرہ کار میں ہمارے عزیز رشتہ دار' ہمارے دوست احباب اور ماتحت وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود بھی ہماری ذات کا اچھا یا برا کچھ نہ کچھ اثر ہمارے اردگرد کے لوگوں پر یا ماحول پر ضرور پڑتا ہے۔

ہماری بات چیت' ہمارا رویہ اور آپس میں سلوک' ہمارے خیالات' مشغلے' ارادے' دلچسپیاں غرض کہ ہمارے ہر فعل کا ہمارے اردگرد کے لوگوں پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے کسی شوق یا گفتگو سے لوگ یا تو متفق ہوں گے یا اختلاف کریں گے۔ اگر ہم بری بات کہیں گے تو وہ لوگ جن کے دل میں ایسی ہی بات ہوگی ان کے بھی برے جذبات کو تقویت ملے گی۔ اسی طرح اچھی سوچ یا اچھا کام دیکھ کر بھی ہمارے دائرہ کار میں اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اچھائی یا بھلائی کو تقویت ملتی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اچھے یا برے کام کا انجام سامنے ضرور آتا ہے۔ اچھا کام کرنے اور بھلائی کو فروغ دینے والوں کو ویسا ہی بدلہ ملتا ہے۔ برے کام کا برا نتیجہ ہی سامنے آتا ہے چاہے وقتی طور پر اس میں کچھ فائدہ نظر آتا ہو۔

'' پھر جس نے ذرا برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرا برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ '' (99:7-8)

لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ نیکی اور برائی صرف وہی نہیں ہے جو صرف ہم عملاً یا بات چیت کے ذریعے کرتے ہیں۔ محض ہماری ذات سے بھی جو برائی پھیلے گی اس کے لیے بھی ہم ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے اور روز قیامت ہم سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اسی طرح اگر ہم اچھے اعمال کرتے ہیں اور ہمارے قول و فعل سے ہمارے دائرہ کار میں اچھائی پھیلتی ہے تو جہاں اچھا عمل کرنے والوں کو جزا ملے گی وہیں ہم بھی اس اجر و ثواب میں برابر کے شریک ہوں گے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔

'' جس کسی نے بھی لوگوں کو کسی نیکی کر طرف بلایا تو ایسے شخص کو ان تمام لوگوں کے برابر اجر و ثواب

ملے گا جو اس نیکی پر عمل کریں گے اور اس سے نیکی پر عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کمی نہ ہوگی اور جس کسی نے لوگوں کو کسی برائی اور گمراہی کی طرف بلایا تو اس آدمی کو ان تمام لوگوں کے برابر سزا دی جائے گی جو اس برائی میں مبتلا ہوں گے اور اس سے برائی کرنے والوں کی سزا میں کوئی کمی نہ ہوگی۔'' (مسلم)

اس حدیث سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ بحیثیت انسان اور ایک مسلمان ہونے سے ہم پر کتنی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ ہمارا ہر قول اور ہر عمل درحقیقت دوسروں پر ایک اہم نقش چھوڑ جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں نہایت احتیاط اور ذمہ داری سے زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ کہیں ایسا نہ ہو دوسروں کے لیے اچھا نمونہ چھوڑنے کی بجائے ہم برائیوں کے بیج بو دیں اور وہ بری باتیں اور برے اعمال بڑھتے بڑھتے اس قدر زیادہ ہو جائیں کہ ہماری آنے والی نسلیں بھی ان خراب اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ ایک اچھا انسان اور مسلمان ہونے کے ناطے ہماری یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ ہم سے دنیا میں بھلائی اور خیر پھیلے اور شر ختم ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

'' اے پروردگار ہمیں نیک لوگوں کا امام بنا۔ '' (25:74)

روزمرہ کی زندگی میں اگر ہم دیکھیں تو امام اپنے پیچھے والے لوگوں کے لیے نمونہ ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے وہی اس کے پیچھے کھڑے ہونے والے لوگ کرتے ہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہمیں اچھے اعمال کرنے کی توفیق دے۔ ہم ایسے انسان بنیں کہ ہماری زبان سے دوسروں کے لیے اچھی بات ہی نکلے۔ ہم سے کسی کی دل آزاری اور برائی نہ ہو۔ ہماری زندگی اور ہمارے اعمال ایسے ہوں کہ ہمارے اردگرد کے لوگ ہم سے متاثر ہوں اور ہم جیسا یا بہتر بننے کی خواہش کریں۔ ہمارے کئے ہوئے اچھے اعمال سے ان کی نیکی اور بھلائی کے جذبات اُبھریں اور نفرت' بغض وعناد اور دشمنی کا خاتمہ ہو۔

یقین کیجئے کہ اگر برائی کو اس قدر سہارا نہ ملے اور ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک پھیلنے کا موقع نہ ملے تو ہر برائی کا وہیں قلع قمع ہو جائے اور آج یہ دنیا امن ومحبت اور خوشیوں کا گہوارہ بن جائے۔

قرآن میں ہے۔

'' اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔ '' (9: 2)

ایک اور جگہ آیا ہے۔

'' (مومنو!) جتنی امتیں لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور

برے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔ '' (3:110)

'' منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس ہیں (یعنی ایک ہی طرح کے ہیں) کہ برے کام کرنے کو کہتے اور نیک کاموں سے منع کرتے اور (خرچ کرنے سے) ہاتھ بند کیے رہتے ہیں۔ انہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے ان کو بھلا دیا۔ بے شک منافق نافرمان ہیں۔ ''

(9:27)

سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے کام یا اعمال ہیں جن کو برا کہا گیا ہے اور وہ کون سے اعمال ہیں جن کو اچھا کہا جاتا ہے؟ اعمال کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر نہیں چھوڑا کیونکہ انسان اپنی ذاتی پسند یا ناپسندیدگی کی وجہ سے بعض کاموں کو اچھا یا برا سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب یعنی قرآن پاک کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر نازل کیا ہے۔ اس کے علاوہ رسول اکرم ﷺ کی ذات مکمل طور پر قرآن کی زندہ صورت تھی۔ اس لیے وہ سب کام برے ہیں جن سے اللہ اور رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ ایسے کام کرنے سے نا صرف اپنی ذات کو نقصان پہنچتا ہے اور انسان بے چینی، بے سکونی، بے اطمینانی کا شکار ہوتا ہے بلکہ آہستہ آہستہ یہ بے چینی اور بے سکونی پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ برائی شروع شروع میں ایک بہت چھوٹا سا عمل ہوتا ہے جو کہ آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہو جائے تو پورے معاشرے کی جڑیں تک ہلا ڈالتا ہے۔ اگر ہم اچھے اور برے اعمال کی تفصیل میں پڑ جائیں تو یہ صفحات کم ہو جائیں گے۔ مختصراً یہ کہ ہم میں سے ہر شخص اگر یہ سوچ اور سمجھ لے کہ ایسا کام یا ایسا عمل جس کو قرآن اور حدیث میں منع کیا گیا ہے اور جس سے کسی کی دل آزاری، کسی پر زیادتی یا کسی دوسرے کی حق تلفی ہونے کا ڈر ہے، ایسے کام سے احتراز کرنا چاہیئے اور کوئی بھی عمل کرتے وقت دل میں ایک سیکنڈ کو ضرور سوچنا چاہیئے کہ یہ عمل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو پسند آئے گا یا نہیں۔ اچھے کام یا نیکی کے کام وہ ہیں جن سے معاشرے میں اچھی روایات تشکیل پاتی ہیں، بھلائی اور خیر کے جذبات کو فروغ ملتا ہے، معاشرے میں محبت و یگانگت اور سکون کی فضا قائم ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اچھائی اور برائی کو فرداً فرداً سمجھایا جائے سب کو حقیقت معلوم ہے پھر بھی ہم برے کاموں سے باز آتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو روکنے کی ہمت کرتے ہیں کیونکہ ہم نے اپنے اپنے دلوں کو یہ اطمینان دلا دیا ہے کہ ایسا ہونا بہت مشکل ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آج اگر ہم اپنا اپنا احتساب کرنا شروع کریں، اپنے آپ کو بدلنے کے لیے تیار ہوں، اپنی اصلاح خود ہی کر لیں اور برائیاں اور برے کام چھوڑ کر راہ راست پر آ جائیں

تو صدیاں نہیں، سال نہیں بلکہ چند دن بھی نہیں صرف چند گھڑیاں چاہئیں جس میں سچ مچ ایک خاموش انقلاب آ سکتا ہے۔

آیئے ہم سب مل کر یہ عہد کریں کہ اللہ کی اس خوبصورت کائنات کو مزید تباہیوں اور بربادیوں کا شکار نہیں ہونے دیں گے، اس کی مخلوق کو ناحق اذیت نہیں پہنچائیں گے۔ ہم میں سے ہر شخص یہ تہیہ کر لے کہ اس نے ہر ممکن طریقے سے ہاتھ سے، زبان سے، عمل سے، اپنی حیثیت مال، عہدے حتیٰ کہ اپنی ایک ایک صلاحیت کی مدد سے دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچانا ہے، گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانا ہے، ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ کرنا ہے، حق کا ساتھ دینا ہے تو وہ دن دور نہیں جب ہم اپنے اللہ کے حضور حاضر ہوں گے تو وہ اپنا وعدہ سچ کر دکھائے گا جو اس نے اپنے بندے سے کر رکھا ہے یعنی

''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے تو ان کے لیے ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔''

(41:8)

☆ _____ ☆

غلط اور صحیح کی پہچان

اس دنیا میں ہر انسان اپنی الگ ذہنیت رکھتا ہے۔ ہر کوئی اپنے ماحول، مذہب، سماجی اور معاشرتی رجحان کے باعث اپنی سوچ کو ایک خاص رخ دیتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں کم و بیش سب ہی برائی سے روکتے ہیں اور اچھائی کا درس دیتے ہیں۔ جن مذاہب میں ہمیں غلط روایات نظر آتی ہیں وہ انسان کی خود ساختہ ہیں۔ اپنی مرضی سے ان چیزوں کو مذہب میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح ہر معاشرہ اپنے اپنے طریقے سے اچھائی کی پرورش کر رہا ہے۔ اجتماعی طور پر تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن انفرادی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بات کچھ بگڑ جاتی ہے جس کی مثال ایسے ہے کہ چوری ایک غیر قانونی عمل ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں اس کو ایک جُرم سمجھا جاتا ہے، ہر ملک نے اس سے بچنے کے لیے قاعدے اور قوانین بنائے ہیں لیکن جب ایک چور چوری کرتا ہے تو وہ کسی نہ کسی طریقے سے اپنے آپ کو اس جُرم کرنے کا حق دار قرار دیتا ہے اس کی وجہ حالات کی خرابی، تنگی معاش، ضروریات، نشے کی عادت، یا پھر عادتاً چوری کرنا کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال جب انسان کوئی بھی غلطی کرتا ہے تو کسی نہ کسی بہانے سے اسے اچھا بنا کر ضرور پیش کرتا ہے چاہے دل سے جانتا ہو کہ یہ غلط ہے۔ اس صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ انفرادی سوچ میں تبدیلی لائی جائے اور کوئی کام قانونی یا سماجی طور پر بُرا ہو یا اچھا انفرادی سوچ اتنی مضبوط ہونی چاہیئے کہ ہر فرد اپنی ذمہ داری سمجھے کہ یہ کام غلط ہے اور اس کو روکنا ہے چاہے اس کے لیے کوئی روک ٹوک ہے یا نہیں۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کوئی برائی عام ہو جاتی ہے تو ہم اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور ہمیں وہ برائی برائی نہیں لگتی اور ہر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ سب ہی کر رہے ہیں ایک عام دستور سا بن جاتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے چاہے ہر کوئی کر رہا ہے اس کے باوجود ہماری انفرادی سوچ اتنی واضع ہونی چاہیئے کہ ہم آسانی سے اچھے اور بُرے کے چکر سے نکل کر صحیح اور غلط سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ سب سے پہلے یہ غور کریں کہ اچھے بُرے اور صحیح غلط میں فرق کیا ہے؟ کئی افعال ایسے ہوتے ہیں جو دیکھنے اور کرنے میں بہت اچھے لگتے ہیں اور ہمارے ہاں تو ہر کوئی وہ کرنے کو تیار ہے جو اچھا لگتا ہے چاہے وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو۔ مثلاً فضول خرچ ہونا ایک ایسی عادت ہے جو یقیناً غلط ہے لیکن جب کوئی دوستوں پر، لباس پر یا کسی بھی چیز پر بے تحاشا خرچ کرتا ہے تو دیکھنے والے اس پر رشک کرتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ یہ غلط ہے پھر بھی اسے اچھا سمجھتے ہیں۔ اس طرح ایک مثال شادیوں پر خرچ کرنے کی ہے آپ دیکھیں سب جانتے ہیں کہ اس دور میں زیور، کپڑا بنانے کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اس تیزی سے بدلتے دور میں

لڑکیوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعے مضبوط اور خود اعتماد بنا کر ان کی آنے والی زندگی کو مزید محفوظ بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن پھر بھی ہم ایسا نہیں کرتے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اچھے برے کے چکر میں ایسے جکڑے گئے ہیں کہ صحیح اور غلط دیکھنے کی ہمیں فرصت ہی نہیں رہی۔ جبکہ ہمارے لیے یہ تو سب کچھ آسان تھا کیونکہ ہماری قوم کا تعلق اس مذہب سے ہے جس میں پانی پینے کے طریقہ کار تک کی وضاحت کی گئی ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہوا کہ ہم دوسری قوموں سے بھی پیچھے رہ گئے اور یورپ اور امریکہ جیسی قوتیں ترقی کی دوڑ میں ہم سے آگے نکل گئیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ امریکہ یا کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں یہ عام دستور ہے کہ اگر آپ کسی کے گھر بغیر اطلاع جائیں اور میزبان کسی مصروفیت کی وجہ سے آپ کو ٹائم نہ دے سکے تو وہ بڑے ہی نرم لہجے میں معذرت کر لے گا کہ اس وقت میں مصروف ہوں آپ پھر آیئے گا' یہ عام دستور ہے اور مہمان برا بھی نہیں مناتے کیونکہ وہ بغیر اطلاع کے آنے کی وجہ سے اس صورتِ حال کے لیے پہلے ہی سے تیار ہوتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں بچوں سے یا پھر ملازم سے جھوٹ بلوایا جاتا ہے کہو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف میں اس بارے میں کیا ہدایات موجود ہیں۔

> ''اگر گھر میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے اس میں داخل نہ ہو اور اگر (یہ) کہا جائے کہ (اس وقت) لوٹ جاؤ تو لوٹ جایا کرو یہ تمھارے لیے بڑی ہی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام تم کرتے ہو خدا سب جانتا ہے۔'' (24:28)

مان لیا کہ گھر سے کسی کو لوٹانا اچھا نہیں لگتا لیکن غور کریں تو معلوم ہوگا کہ صحیح یہی ہے۔ جب آپ کے گھر میں کوئی بغیر اجازت کے آتا ہے تو جان چھڑانے کے لیے ہزار طرح کے جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔ اگر کوئی کامیاب جھوٹ نہ بن پائے تو چہرے سے بیزاری صاف ظاہر ہوتی ہے' دل میں لعن وطعن اور چہرے پر منافقوں کی سی مسکراہٹ لیے کوئی کیسی مہمان نوازی کرے گا؟ خدا کا فرمان مان کر ہم یقیناً اس صورتِ حال سے بڑے اچھے طریقے سے بچ سکتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ صحیح ہونے کے باوجود ہمیں یہ برا لگتا ہے۔ اگر ہم یہ پہلا قدم اٹھانے پر تیار ہو جائیں تو ہماری نسلیں جھوٹ کی لعنت سے بچ سکتی ہیں۔ اس طرح روزمرہ کی زندگی میں ہزاروں ایسی مثالیں ہیں جہاں ہم اچھے برے کے فرسودہ نظام کو ختم کر کے نئے سرے سے صحیح وغلط کے اصول پر ایسا معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں جس کی بنیاد مضبوط سماجی و معاشرتی اعتمادات پر رکھی گئی ہو۔ یہی وہ نظامِ زندگی ہوگا جو ہمیں اس قابل بنائے گا کہ ہم اپنا شمار بہترین قوموں میں کر سکیں اور یہ ہم ابھی اس وقت کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کا تعلق کسی مذہب یا معاشرے سے ہونا ضروری نہیں ہے کہ آپ کی تعلیم کتنی ہے یا آپ کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ یہ تبدیلی انفرادی سوچ پر مبنی ہے اس لیے اس کا تعلق ہم سب کی سوچ سے ہے۔ جبکہ اس انفرادی سوچ کے بدلنے سے جو

اثرات ظاہر ہونگے وہ یقیناً بہت وسیع ہونگے۔ آیئے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھیں گے کہ صحیح اور غلط کیا ہے اور صحیح اقدام ہی اٹھائیں گے۔ چاہے ہمیں اور ہمارے اردگرد کے لوگوں کو کتنا ہی برا لگے گا۔ ہمیں اسی اصول پر قائم رہتے ہوئے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھنی ہے جو صحیح اقدار کا حامی ہو۔

☆ _____ ☆

اخلاق

زبان انسان کی شخصیت اور کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جو آپ کے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے۔ انسان کے اخلاق اور طور طریقوں کا اندازہ بھی اس کی زبان سے لگایا جاتا ہے۔ اگر آپ کے اخلاق اچھے ہیں تو لوگ آپ سے ملنا جلنا اور بات کرنا پسند کرتے ہیں اور آپ کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہوتا ہے۔ آپ لوگوں میں با اخلاق اور ملنسار جیسے القابات سے نوازے جاتے ہیں۔ اگر ایک اور طرح سے دیکھا جائے تو جب انسان مر جاتا ہے تو اچھے با اخلاق شخص کو لوگ مرنے کے بعد بھی اچھے لفظوں سے یاد کرتے ہیں اور بد اخلاق شخص کے بارے میں جب بھی لوگ گفتگو کریں گے اس کی برائی ہی کریں گے۔ اگر آپ کے اخلاق بلند ہیں تو آپ ہر کسی کو اچھے مشوروں، نصیحتوں اور اچھے تجربات کی مثالیں دیں گے مگر برا شخص ہر کسی کی برائی چاہتا ہے اپنے علاوہ۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں بیان فرمایا ہے جن کے اخلاق بلند ہیں اور وہ ہر ایک سے محبت سے بات کرتے ہیں۔

'' اور جب تم کو کوئی دعا دے تو جواب میں تم اسے بہتر کلمے سے دعا دو یا انہیں لفظوں سے دعا دو۔ بے شک خدا ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ ''(4: 86)

اسی طرح ایک حدیث شریف میں ہے کہ:

'' اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ '' (متفق علیہ)

بالکل اسی طرح سے اگر انسان اچھے کام کرتے وقت اپنے ذہن میں یہ بات شامل کر لے کہ وہ کام کرنے سے اسے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی تو اس کے کام کرنے سے اجر میں اضافہ ہو جائے گا۔

'' ان لوگوں کی بہت سی مشورتیں اچھی نہیں ہاں اس شخص کی مشورت اچھی ہو سکتی ہے جو خیرات یا نیک بات لوگوں میں صلح کرنے کو کہے اور جو ایسے کام اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرے گا ہم اس کو بڑا ثواب دیں گے۔ '' (4: 114)

بری باتیں کرنے سے ہم میں فساد اور فتنہ پیدا ہوتا ہے اور یہ سب کام ہم سے شیطان کرواتا ہے۔ اگر ہم شیطان کے کہنے سے بری باتیں کر سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق اچھی باتیں نہیں کر سکتے جن کے باعث بھلائی پھیلتی ہے۔

'' اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ (لوگوں سے) ایسی باتیں کیا کریں جو بہت پسندیدہ ہوں۔ کیونکہ شیطان (بری باتوں سے) ان میں فساد ڈلوا دیتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ '' (17: 53)

برے لوگوں کی برائی سے بچو اور خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چلو کیونکہ غرور اور تکبر خدا کو پسند نہیں اور نہ ہی مومنوں کی نشانیاں ہیں۔ مومن کی شان تو یہ ہے کہ:

'' اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانا) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔ '' (25: 63)

ضروری نہیں کہ برائی کا بدلہ برائی سے دیا جائے بلکہ برائی کا بدلہ اچھائی سے بھی دیا جا سکتا ہے تا کہ لوگ اچھائی کی طرف مائل ہو جائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک مرتبہ اچھا بدلہ دینے کے بعد سمجھ لیا جائے کہ اگر دوسرا شخص بدل نہیں رہا یا اچھا نہیں بن رہا تو وہ کبھی بھی اچھا نہیں بن سکتا۔ اچھائی کو پھیلانے کی کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اچھائی کی عمر بہت لمبی اور برائی کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ جہاں تک ہو سکے اپنے حسن وسلوک اور اخلاق سے دوسرے لوگوں کے دلوں کو جیتنا چاہیئے۔ خدا بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو ہمت نہیں ہارتے۔

'' اور اس شخص سے بات کا اچھا کون ہو سکتا ہے جو خدا کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ تو (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے اور یہ بات ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں اور ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صاحبِ نصیب ہیں۔ اور اگر تمہیں شیطان کی جانب سے کوئی وسوسہ پیدا ہو تو خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔ بیشک وہ سنتا جانتا ہے۔ '' (32: 33-36)

اچھا اخلاق رکھنا ایک بہت بڑی انسانی صفت ہے۔ حقیقتاً یہی صفت ہم میں اور جانوروں میں تفریق کرتی ہے۔ آج کل حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہی نظر آتا ہے کہ ہم میں سے چند گنے چنے افراد ہی ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہوں اور وہ تعلقات میں نرمی، برداشت اور شفقت کا برتاؤ کریں۔ حالات کتنے ہی ناگزیر کیوں نہ ہو جائیں وہ تمیز اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ورنہ صورتِ حال یہ ہے کہ ذرا سی بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ قوت برداشت اتنی کم ہو گئی ہے کہ ہم سے دوسرے کی معمولی سی بات بھی نہیں سہی جاتی اور ہم بدلہ لینے کے چکر میں ساری اخلاقی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ دوسرے کے بارے میں گھٹیا الفاظ کا استعمال، گالی گلوچ، بدزبانی، یہاں تک کہ

مار کٹائی اور ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ بداخلاقی کی انتہا نہایت سنگین قسم کے نتائج مرتب کرتی ہے جو کہ بعض مرتبہ قتل تک جا پہنچتے ہیں۔ جب بھی ہم کسی شخص سے پہلی مرتبہ متعارف ہوتے ہیں تو سب سے پہلے ہم اس کے اخلاق کو جانچتے ہیں۔ ہم اس کی ایک ایک حرکت اور منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اور آداب کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور اپنے دماغ میں ایک تاثر قائم کر لیتے ہیں کہ یہ شخص اچھا انسان محسوس ہوا ہے یا برا اور اس اچھائی یا برائی کی بنیاد صرف اس شخص کا اخلاق ہی ہوتا ہے۔ اگر تو وہ شخص اچھے اخلاق سے پیش آتا ہے یعنی اچھے طریقے سے سلام کرتا ہے، عزت اور نرمی سے پیش آتا ہے اور انسان ہونے کے ناطے آپ کی عزت و تکریم کا خیال رکھتا ہے تو یقیناً آپ ایسے شخص کے پاس بیٹھنا بھی پسند کریں گے اس سے بات کرنے کو بھی آپ کا جی چاہے گا اور آئندہ مستقبل میں بھی آپ ایسے شخص سے اچھے تعلقات رکھنا پسند کریں گے۔ اسی حوالے سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

'' اے محمد ﷺ خدا کی مہربانی سے تمہارا مزاج ان لوگوں کے لیے نرم واقع ہوا ہے اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے..... ۔ ''

(3: 159)

یہ حقیقت ہے کہ بدمزاج اور بداخلاق انسان جسے نہ بات کرنے کی تمیز ہو نہ برتاؤ کرنے کے آداب ایسے شخص کے پاس کوئی بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتا تعلقات قائم کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو باتہذیب، اعلیٰ اخلاق سے مزین، نرم دل اور نرم مزاج دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اس لیے قرآن پاک میں کئی جگہ حسن اخلاق کی تاکید کی گئی ہے۔

'' اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا۔ '' (2: 83)

ایک اور جگہ حضور ﷺ کے لیے کہا گیا ہے:

'' بے شک آپ ﷺ اخلاق کے بہت عظیم درجے پر ہیں۔ '' (68: 4)

'' اور جب بیہودہ بات سنتے ہیں تو اُس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال تم کو سلام ہم جاہلوں کے خواستگار نہیں ہیں۔ ''

(28: 55)

ان سب باتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اچھے اخلاق کا تقاضہ ہے کہ ہر صورت میں تہذیب قائم رکھیں۔ اگر دوسرا بدتمیزی کرے یا اشتعال میں ہو یا جاہلانہ گفتگو یا حرکتیں کرے تب بھی اپنے کام سے کام رکھیں اور جاہل کہ منہ لگنے

سے پرہیز کریں۔

'' اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوسکتی (تو سخت کلامی کا) ایسے طریقے سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ تم میں اور جس دوسرے میں دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے اور یہ بات ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں اور ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صاحبِ نصیب ہیں۔ '' (32: 33-35)

یہ حقیقت ہے کہ کسی کی بداخلاقی یا بدتمیزی کے جواب میں خاموش رہنا یا ویسی ہی حرکت نہ کرنا اور ویسا خراب رویہ نہ رکھنا کسی کسی کا ہی حوصلہ ہوسکتا ہے۔ خاص طور پر قدرت رکھتے ہوئے بھی اپنی مرضی سے دوسرے سے اس کے برے سلوک کے جواب میں اچھی طرح سے پیش آنا بڑے ہی حوصلے کی بات ہے اور اس طریقے سے آپ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی اپنا دوست بنا سکتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کا اخلاق اس قدر اعلیٰ درجے کا حامل تھا کہ جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ہر وقت چہرے پر ایک نرم اور شفیق جذبہ موجزن رہتا تھا۔ دوست تو دوست دشمن اور کفارِ مکہ تک آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کے گرویدہ تھے۔ کبھی کسی نے آپ ﷺ کے منہ سے ناپسندیدہ بات نہیں سنی۔ آپ ﷺ انتہائی خوش اخلاق تھے۔ جو بھی آپ ﷺ سے ملتا وہ آپ ﷺ کا گرویدہ ہو جاتا تھا یہی محسوس کرتا تھا کہ جیسے آپ ﷺ اس کو ہی سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ قرآن میں آیا ہے۔

'' (لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں۔ '' (9: 128)

اسلامی تعلیمات اور حضور اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ کا مطالعہ کرنے سے ہی ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اچھا انسان اور اچھا مسلمان بننے کے لیے اپنے اخلاق و عادات کو سنوارنا کس قدر ضروری ہے اچھا عمل اور اچھا اخلاق ہی درحقیقت ہمیں صحیح معنوں میں انسان بناتا ہے اور ہمیں اس قابل کر دیتا ہے کہ ہم ایک اچھے معاشرے کی تشکیل دے سکیں جس میں ہر شخص کی عزت و تعظیم کی جائے اور کسی کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔

☆ _____ ☆

زبان کا زندگی پر اثر

زندگی میں کئی چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن ہم میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔ اگر ہم باتوں کا احساس کرنے لگیں تو ہماری زندگی پر ان کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس کی مثال روزمرہ کی عام زندگی سے ہی لے لیتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم دن کا آغاز ہی کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہونے لگتا ہے کہ آج کا دن کچھ خاص اچھا نہیں ہے تو فوراً ہم یہ کہتے ہیں کہ آج کس کا منہ دیکھا ہے جو آج کا دن اچھا نہیں ہے۔ جبکہ اکثر اوقات اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خود کسی وجہ سے اچھا محسوس نہیں کر رہے ہوتے اور اس کا اثر ہمارے کاموں پر پڑتا ہے اور سب کام غلط ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور ہم یہ گمان کر کے کہ یہ کسی اور کی وجہ سے ہو رہے ہیں اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح ہماری بہت سی عادات ایسی ہوتی ہیں جو ہماری اچھی زندگی میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں لیکن ہم اس سے واقف نہیں ہوتے اور اپنی ناکامیوں کا جواز ادھر ادھر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ عام فہم زبان میں جب ہم ترقی یافتہ ملکوں کا ذکر کرتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں وہ ہم سے آگے ہیں یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔ جبکہ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے ہونے سے جو ترقی انہوں نے کی ہے وہ ترقی تو ہم نے بھی کی ہے۔ اس سے تو ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ کونسی ایسی چیز ہے جو ہمارے ملک میں نہیں ہے یا پھر کونسا ایسا علاج ہے جو یہاں نہیں ہوتا؟ ایٹم بم تک تو ہم بنا چکے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس رفتار سے ترقی نہیں کر پا رہے جس سے وہ کر رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر رہے ہیں جن کو وہ لوگ نظر انداز نہیں کرتے۔ یہ باتیں ہی ہیں جو ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ مسکراہٹ کو لے لیں ایک ایسی عادت ہے جو پیسوں سے خریدنی نہیں پڑتی پھر بھی ہم مسکرانے کے عادی نہیں ہیں۔ وہی بات جو ہم کسی سے روکھے انداز سے کرتے ہیں اگر ہم مسکرا کر کریں تو اس کا اثر ہی کچھ اور ہوگا۔ لیکن ہم جانتے نہیں ہیں فقط مہربانی یا پھر شکریہ کا لفظ استعمال کر کے آپ اپنے لیے زندگی میں کیا آسانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس مثال سے لگائیں۔ ایک فرانسیسی سیاح دنیا گھومنے کے لیے اس طرف نکلا جہاں کی زبان اس کو نہیں آتی تھی اور نہ ہی اسے انگریزی آتی تھی اس نے دو لفظ Please اور Thank You سیکھ لیے اور وہ آدھی دنیا ان دو ہی الفاظ کے سہارے گھوم آیا جب وہ واپس آیا تو لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ زبان سے ناواقفیت کے باوجود وہ آدھی دنیا کی سیاحت خیر و عافیت سے کر آیا تو اس کا جواب یہ تھا کہ جب میں کسی ملک میں داخل ہوتا تھا تو مہربانی کا لفظ استعمال کرتا تو لوگ میری مدد

کے لیے تیار ہو جاتے تھے اور میں شکریہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا تھا مجھے کوئی مشکل نہیں اٹھانا پڑی۔ اسی طرح آپ نے دیکھا ہوگا کہ آپ خریداری ہمیشہ اس دکاندار سے کرنا چاہتے ہیں جو خوشگوار لہجے میں آپ سے بات کرے۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ، مہربانی اور شکریہ کہنے سے جو اثرات رونما ہوتے ہیں وہ بہت وسیع ہیں۔ حالانکہ دیکھنے میں یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں لگتی ہیں اور ہم ان پر بھی توجہ نہیں دیتے۔

قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے۔

'' اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا۔ '' (2: 83)

آیئے دیکھتے ہیں کہ اچھی باتیں کیا ہیں؟

☆ کہتے ہیں انسان کی اصلیت اس کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے یعنی انداز گفتگو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کس قسم کی شخصیت کے مالک ہیں۔ اکثر لوگ بڑی بہادری سے اپنے آپ کو چھپانے میں بظاہر کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن لمبے عرصے تک کامیاب نہیں ہوتے کیونکہ جب وہ سوچ کر بات کریں تو ٹھیک ہے لیکن غصے میں افراتفری میں یا پھر کسی بھی غیر معمولی صورتِ حال میں اپنی اصلیت پر اُتر آتے ہیں اور الفاظ کی جگہ ان کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے اور ساری اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ایسے انسان کی لوگ بظاہر عزت کر بھی لیں تو دل سے اس کی عزت کوئی نہیں کرتا جس انسان کو اپنی زبان پر قابو نہیں ہے وہ انسانیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا لہٰذا بولنے میں جو سب سے پہلی بات پیش نظر رکھنی چاہیئے وہ زبان کی شائستگی اور پاکیزگی ہے۔

☆ زندگی میں ہر کسی کو اختلاف رائے کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اپنی رائے کو دوسروں پر مسلط کرنا اور بحث برائے بحث کی عادت ڈال لینا یقیناً منفی رویہ ہے۔ قرآن پاک نے ہمیں اس سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں وہ کچھ ایسے ہیں:

'' اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ کوئی علانیہ کسی کو برا کہے مگر جو مظلوم ہو اور خدا (سب کچھ) سنتا اور (جانتا) ہے۔ '' (4:148)

یعنی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اگر کسی کے ساتھ اختلافات بھی ہوں تو اس کا اعلان نہ کرتے پھریں ہاں اگر کوئی اختلاف بڑھ کر زیادتی کی شکل اختیار کر لے تو اور بات ہے وہ تو پھر خدا سنتا اور جانتا ہے۔

☆ ہر کسی کو اپنی رائے رکھنے کا پورا حق حاصل ہے کچھ لوگ کم علمی کے باعث یہ خیال کرتے ہیں کہ وہی عقلِ کل کے مالک ہیں تو ان کو اسی طرح خوش رہنے دیں اور بڑی شائستگی سے اپنا راستہ بدل لیں یہی مہذب

لوگوں کا طریقہ کار ہے۔

☆ سلجھے ہوئے لوگ ناپ تول کر بولتے ہیں۔جس شخص کو اپنے الفاظ کی قدر و قیمت کا احساس ہوگا وہ تو سوچ سمجھ کر ہی کوئی بات منہ سے نکالے گا۔اکثر لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ مفت مشورے دیتے رہتے ہیں' مشورہ دینا اچھی بات ہے لیکن جب کوئی مشورہ مانگے تو تب ہی دینا چاہیئے۔اپنی رائے کو بہترین جان کر دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرنا بداخلاقی ہے۔کم علمی کے باعث لوگ اِس حقیقت سے ناواقف نظر آتے ہیں کہ کس طرح ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کے سارے راز کھول رہا ہے۔بظاہر عمدہ لباس پہن لینے یا بڑی گاڑیوں میں پھرنے سے بہت کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔لیکن ان کے اندر کا حال ان کے اطوار اور خاص طور پر ان کی گفتگو سے دیکھا جا سکتا ہے۔اگر ہم یہ جان لیں کہ وہ کون سے موضوعات ہیں جو زیرِ بحث لانے سے ہماری اپنی کمزوریاں ظاہر ہونگی تو ہم یقیناً ان سے پرہیز کریں گے۔مثلاً چغل خوری' مقابلہ بازی' طعنہ بازی اور اترانا ایسی عادات ہیں جو انسان کے چھوٹے پن اور احساسِ کمتری کا منہ بولتا ثبوت ہیں لیکن لوگ پھر بھی اپنے آپ کو ان کمزوریوں کے اظہار سے روک نہیں پاتے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ جس وقت وہ بولتے چلے جائیں گے ان کی اپنی حیثیت دوسروں کی نظروں میں گرتی چلی جائے گی اور ان کا بظاہر خوش وخرم نظر آنا دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

☆ کسی کی چھوٹی سی بھی اچھائی کی تعریف کرنا' کسی کی حوصلہ افزائی کرنا یا اچھی باتیں جن سے لوگ خوش بھی ہوں اور فائدہ بھی اٹھائیں زبان کا بہت عمدہ استعمال ہوسکتا ہے۔ایک مرتبہ ایک شخص اپنے دوست کے ساتھ بچوں کے ایک سکول کے پاس سے گزر رہا تھا۔اس نے دیکھا کہ ایک ٹیچر بس سے اُترتے وقت سخت غصے میں تھی شاید وہ سکول میں بچوں سے پہلے داخل ہونا چاہ رہی تھی۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بچوں کو دھکا دے کر آگے نکل جائے لیکن اصولاً اُسے بچوں سے پیچھے ہی رہنا تھا۔ وہ شخص یہ سب صورتِ حال دیکھ رہا تھا وہ فوراً ٹیچر کے پاس پہنچا اُسے صبح بخیر کہا اور کہنے لگا کہ میں تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس سکول کے ٹیچر کس قدر خوش لباس اور بااخلاق ہیں خدا آپ پر اپنی رحمت کرے یہ سن کر ٹیچر کے چہرے پر رونق سی آ گئی اور تناؤ ختم ہو گیا اُس نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور سکول میں داخل ہوگئی۔اس شخص کا دوست جو یہ سب بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ نہ تو اس ٹیچر کا لباس بہت اچھا تھا اور نہ ہی وہ بااخلاق تھی یہ سب کیا ماجرا ہے؟ اس شخص نے جو وضاحت کی وہ کچھ اس طرح تھی ''جب میں نے دیکھا کہ یہ ٹیچر بچوں سے سخت بیزار ہے تو میں نے سوچا یہ ابھی انہیں چھوڑ دے گی لیکن کلاس میں نہ دل

لگا کر پڑھائے گی اور نہ ہی بچے کچھ سیکھیں گے اور ان کی زندگی کا ایک بہترین دن ضائع ہو جائے گا۔ تم نے دیکھا کہ ذرا سی تعریف سن کر اس کا چہرہ کھل سا گیا تھا وہ اب یقیناً بہتر موڈ میں رہے گی۔ کسی کی تعریف میں دو فقرے بولنے میں کیا حرج ہے جبکہ یہ رویہ زندگی پر اتنا گہرا اور بہتر اثر چھوڑ سکتا ہے۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہم اپنے اردگرد کے ماحول کو بہت بہتر بنا سکتے ہیں۔

☆ اسی طرح ایک اور عادت جو لوگوں میں عام پائی جاتی ہے وہ Exageration کی ہے جسے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رائی کا پہاڑ بنانا۔ اس میں لوگ بڑے ماہر ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بات ہی بدل جاتی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ:

'' اے اہل کتاب تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ غلط ملط کیوں کرتے ہو اور حق کو کیوں چھپاتے ہو اور تم جانتے بھی ہو۔'' (3: 71)

دراصل ایسے ہوتا ہے کہ ہر کوئی اپنی مرضی سے اپنی پسند کی باتیں شامل کر لیتا ہے اور کم پسند کی بات نکال دیتا ہے جس سے ساری گفتگو کا رخ ہی بدل جاتا ہے اور بات کہیں سے کہیں نکل جاتی ہے اس عادت سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

☆ بعض لوگ اپنی بات میں اثر ڈالنے کے لیے اونچی آواز کا استعمال کرتے ہیں شاید وہ یہ جانتے نہیں ہیں کہ اونچا بولنے والوں کے لیے خدا کا کیا فرمان ہے:

'' اور اپنی چال میں اعتدال کئے رہنا اور (بولتے وقت) آواز نیچی رکھنا کیونکہ (اونچی آواز گدھوں کی سی ہے اور کچھ شک نہیں کہ) سب سے بری آواز گدھوں کی ہے۔ '' (31: 18-19)

اللہ تعالیٰ کے فرمان کے بعد اس سلسلے میں کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ ذرا غور کریں زبان کی ذرا سی جنبش کتنی مشکلات کا باعث بن سکتی ہے اور یہی زبان آپ کے لیے ہزاروں دوست اور چاہنے والے بھی بنا سکتی ہے۔ زبان کی شائستگی سارے ماحول کو پرسکون رکھ سکتی ہے اور اس طرح ہماری زندگی میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

☆ _____ ☆

قول وفعل میں تضاد

منافقت یا قول وفعل میں تضاد اس وقت ہمارے معاشرے کی سب سے سنگین برائی ہے۔قول وفعل میں تضاد کا مطلب یہ ہے کہ جو زبان سے کہا جائے ہمارا عمل اس کے برعکس ہو۔ہم بظاہر نیکی' بھلائی اور اچھائی کی بات کریں لیکن ہمارے اعمال اور حرکتیں بالکل اُلٹ ہوں' ظلم کے خلاف بولیں لیکن عملاً ہم خود ظلم کا ساتھ دے رہے ہوں۔ رشوت' سفارش' جھوٹ اور بے ایمانی کے خلاف زہر اگلتے رہیں لیکن جب وقت آئے تو ہم بھی ان ہی لوگوں کی صف میں جا کھڑے ہوں جو یہ سب برائیاں کرتے ہیں۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایسا رویہ اختیار کرنے والوں کی بڑی واضح تصویر کھینچی ہے فرمایا:

'' اے ایمان والوں ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔اللہ کے نزدیک یہ بہت ناراضگی کی بات ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں ہو۔ '' (61: 23)

قول وفعل میں تضاد ایک ایسی برائی ہے جس کے ذریعے رفتہ رفتہ معاشرے کا ہر فرد اپنی علیحدہ روش پر چلنا شروع ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی برائی چاہے چھوٹی سی ہو یا بڑی اس کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔کیوں کہ ہر شخص ایسی ہوشیاری سے کام لیتا ہے کہ اس کی جانب انگلی بھی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ہم سب جانتے ہیں کہ بڑے بڑے سمگلر' ذخیرہ اندوز' رشوت خور' ہیروئن فروش اور بعض معززین اور شرفاء بھی جو اپنے حلقۂ احباب میں بہت معزز اور باکردار سمجھے جاتے ہیں اور جن کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا عین سعادت اور قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے۔ایک جانب تو ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں لیکن دوسری جانب یہی لوگ معاشرے کا ناسور ہیں۔یہ اپنی جھوٹی اور دوغلی باتوں سے معاشرے میں ایسا زہر پھیلا رہے ہیں کہ آہستہ آہستہ ہماری جڑیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔منافق لوگ صرف یہی نہیں ہیں جن کا ذکر ہوا ہے بلکہ سوچا جائے تو یہ برائی یعنی قول وعمل کا تضاد اب ہم میں سے ہر شخص کر رہا ہے۔کسے معلوم نہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے جھوٹ' بہتان' غیبت' سفارش اور دوسری معاشرتی برائیوں کی شدت سے مذمت کی ہے۔قرآن پاک میں بھی جگہ جگہ ان اخلاقی برائیوں کے انجام سے ڈرایا گیا ہے۔

نمود ونمائش اور اصراف کو اللہ اور رسولِ اکرم ﷺ نے سخت ناپسند فرمایا ہے۔ایسی نمائش اور خرچ جو اصل کو چھپا لے اور کچھ اور ظاہر کرے منافقت ہے۔جب ہم دوست احباب آپس میں بات چیت کرتے ہیں تو ہم سب ہی ایسے شخص کو برا جانتے ہیں۔لیکن جب ہمارا وقت آتا ہے تو ہم بھی انہیں لوگوں کی صف میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔قول و

عمل کا تضاد یا منافقت یعنی منہ پر کچھ اور ہے اور دل میں یا عمل کچھ اور ہے۔ایک حدیث میں حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ :

''جس رات مجھ کو معراج کرائی گئی میں نے ایسے لوگ دیکھے جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا اے جبرائیلؑ! یہ کون ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ آپ ﷺ کی امت کے وہ واعظ ہیں جو لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں اور اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں لیکن عمل نہیں کرتے۔'' (بخاری، بیہقی)

آج کل ہمارے معاشرے کے بالکل ایسے ہی حالات ہیں۔ایک جاہل، ان پڑھ کا کیا کہنا یہاں پر تو یہ حالات ہیں کہ جتنا علم جس کے پاس ہے خاص طور پر دینی علوم پر مہارت رکھنے والے کچھ لوگ بھی جو کچھ کہتے ہیں اس پر پوری طرح سے عمل نہیں کر پاتے۔ایسے لوگوں کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ :

'' کیا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ جبکہ تم کتاب پڑھتے ہو سو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ '' (2: 44)

اور ہم میں سے ہر شخص اپنے آپ کو مجبور اور بے بس ظاہر کر کے جان چھڑا لیتا ہے۔نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ جب ایک عالم فاضل شخص حالات کے آگے اپنی بے بسی کا چرچہ کرتا ہے اور اس کے قول و فعل میں ہمیں تضاد نظر آتا ہے تو مایوسی کی دبیز تہہ مزید گہری ہو جاتی ہے اور برائی اور بری طاقتوں کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔مثال کے طور پر جہیز اور شادی پر نمود نمائش لعنت ہے، ایک ایسی معاشرتی برائی ہے جس کی وجہ سے آج لاکھوں گھروں میں بے شمار مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ہم اپنی اصل قدروں کو کھو رہے ہیں اور گہری کھائی کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔لیکن جب اپنی باری آتی ہے ساری اچھی اچھی باتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور ہم سب بھی وہی کچھ کرنے لگ جاتے ہیں جس کے خلاف خود ہم نے بھی کبھی آواز بلند کی ہوتی ہے، یہ قول و فعل میں تضاد نہیں تو کیا ہے؟

دیکھنے میں آیا ہے کہ منافقت کے بارے میں ہمارا نظریہ ہی مبہم سا ہے۔مثلاً قرآن پاک میں جہاں جہاں منافقین کا ذکر آیا وہ اس دور کے ایسے لوگ تھے جنہوں نے دوغلے پن اور شرارت سے اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ان لوگوں کو منافقین کہا گیا اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سخت الفاظ میں عذاب کا ذکر کیا۔

'' کچھ شک نہیں کہ منافقین لوگ دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہونگے اور تم ان کا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے۔ '' (4: 145)

" منافقوں کو بشارت سنادو کہ ان کے لیے دکھ دینے والا عذاب ہے۔ " (4: 138)

جب ہم منافقین کا ذکر کرتے ہیں تو بات کفار کی ہوتی ہے لہٰذا ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم ان میں سے تو نہیں ہیں؟ ہم کلمہ گو ہیں نبی پاک ﷺ کی شان میں گستاخی ہمارے لیے موت سے بدتر ہے۔ لہٰذا یہ سزائیں بھی ہمارے لیے نہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے اسلام کے ابتدائی دور میں اپنے دوغلے پن سے اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ قرآن تمام کائنات کے لیے اور ہمیشہ کے لیے بھیجا گیا تاکہ پہلی آسمانی کتابوں کی طرح کسی خاص وقت اور خاص لوگوں کی ہدایت کے لیے اُترا۔ اگر آج ہم اپنے اردگرد وہی ماحول دیکھتے ہیں جس میں لوگ بظاہر مسلمان بن کر مسلمانوں کی ہی جڑیں کاٹنے پر تلے ہیں تو پھر ان منافقین اور چودہ سو سال پہلے کے منافقین میں کیا فرق ہے؟

دراصل منافقت کا تعلق انسان کے دل کی اندرونی حالت سے ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو بھی نہیں ہو سکتا لہٰذا یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو ہمارے بس کی بات نہیں ہے کہ ہم کسی کے دل میں منافقت کے درجے کو جان سکیں۔ روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے اپنے ایک صحابی حضرت حذیفہ بن عبداللہؓ کو کچھ ایسے لوگوں کے بارے میں بتایا تھا کہ جن کا شمار اس وقت کے منافقین میں ہوتا تھا۔ نبی پاک ﷺ تو اللہ کے رسول تھے انہیں کئی موقعوں پر اللہ تعالیٰ نے براہ راست وحی کے ذریعے معلومات فراہم کیں۔ اب واقعہ یہ ہے کہ منافقین کی یہ لسٹ حضرت حذیفہؓ کے پاس رہی۔ کسی نے کریدنے کی کوشش نہیں کی کہ اس میں کن لوگوں کو شامل کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ جب خلیفہ بنے تو تب کہیں جا کر حضرت عمرؓ نے صرف یہ دریافت کیا کہ اے حذیفہ بن عبداللہ مجھے صرف یہ بتا دیجئے کہ ان لوگوں میں میرا نام تو شامل نہیں۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں نبی پاک ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر میرے بعد کوئی پیغمبر آتا تو وہ حضرت عمر فاروقؓ ہوتے، خود اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ کہیں ان کا نام منافقین میں شامل نہ ہو۔ ہم سب کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے۔ کہیں ہم کسی غلط فہمی میں زندگی نہ گزار دیں اور بعد میں معلوم ہو کہ منافقین صرف وہ نہیں تھے جو چودہ سو سال پہلے اسلام کے نام پر مسلمانوں سے دھوکہ دہی کرتے تھے۔

اس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہماری بھرپور رہنمائی کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

" منافق مرد اور منافق عورتیں ایک ہی طرح کے ہیں کہ بُرے کام کرنے کو کہتے اور نیک کاموں سے منع کرتے ہیں اور ہاتھ بند کئے رہتے ہیں۔ بے شک منافق نافرمان ہیں۔ "

(9: 67)

اسکے علاوہ بے شمار احادیث ہیں جن کے بغور مطالعہ سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ منافق ہونے کی کیا نشانیاں ہیں

اور ہم کن عادات سے بچ کر اپنے آپ کو منافقین کی فہرست میں شامل ہونے سے روک سکتے ہیں۔ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا' منافق کی تین نشانیاں ہیں اگر چہ وہ نماز پڑھتا اور رمضان کے روزے رکھتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان تصور کرتا ہے لیکن جب بات کرتا ہے تو جھوٹی بات کرتا ہے' جب وعدہ کرتا ہے تو اُسے پورا نہیں کرتا اور جب اُس پر اعتبار کیا جائے تو دھوکہ دیتا ہے۔اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا کہ چند ایسی خصوصیات ہیں جو جس انسان میں پائی جائیں اُسے مکمل طور پر منافق بناتی ہیں اور اگر ان میں سے کوئی ایک خصوصیت بھی موجود ہو تو جب تک وہ انسان اس سے چھٹکارا حاصل نہ کر لے منافق ہی کہلائے گا۔وہ یہ ہیں کہ :

''جب اُس پر بھروسہ کیا جائے تو دھوکہ دے' جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب جھگڑا کرے تو مکاری دکھائے۔'' (بخاری' ابوداؤد' مسلم' ترمذی' نسائی)

اسی طرح حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے کہ :

'' وہ شخص جو دنیا میں دو چہرے لیے ہوئے ہے قیامت کے روز آگ سے بنی ہوئی دو زبانیں لیے ہوئے ہوگا۔ '' (ابوداؤد' دارمی)

کیا یہ سب احکام خداوندی اور احادیث جاننے کے بعد ہم میں سے کوئی بھی یہ چاہے گا کہ منافقت کی زندگی گزارے' ہرگز نہیں۔تو پھر کیوں نہ ہم اپنا محاسبہ کریں' اپنے دلوں کو کریدیں کہ کہیں ہماری زندگی' ذرائع اور توانائیاں اُس راستے پر تو نہیں لگ گئیں کہ جس کا انجام بہت بُرا ہونے والا ہے۔ایک حدیث مبارک ہے کہ :

قیامت کے روز جب میدان حشر میں حساب شروع ہوگا تو اللہ تعالیٰ سب سے پہلے تین قسم کے لوگوں کو بلائے گا وہ شہید' حافظ اور سخی ہوں گے پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے جو عمل کیا اس کی کیا وجہ تھی وہ جواب دیں گے کہ اللہ تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہم نے یہ کام کئے تب فرشتے گواہی دیں گے کہ نہیں تم نے یہ اس لیے کیا کہ تمہارے مرنے کے بعد لوگ تمہیں یاد کریں اور تمہاری تعریف کریں تب اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہوگا کہ سب سے پہلے ان لوگوں کو جہنم رسید کرو۔'' (مسلم' ترمذی' نسائی)

'' اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم خدا نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف رجوع کرو اور پیغمبر کی طرف آؤ تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تم سے اعتراض کرتے اور رکے جاتے ہیں۔ ''

(2: 13)

'' اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں

..... " (2: 11)

" ان سے خدا ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔ " (2: 15)

منافق یا قول و فعل میں تضاد رکھنے والا شخص درحقیقت جھوٹ بول رہا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں قرآن میں ہے۔

" اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔ " (2: 8)

" یہ (اپنے خیال میں) خدا کو اور مومنوں کو دھوکہ دیتے ہیں مگر (درحقیقت میں) اپنے سوا کسی کو دھوکہ نہیں دیتے اور اس سے بے خبر ہیں۔ " (2: 9)

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اس بات پر سچا ایمان رکھیں کہ ہم نے اپنے ہر عمل اور ہر فعل کے لیے اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ ہونا ہے تو ہم خوف خدا سے کبھی ایسی حرکت نہ کریں جس کے لیے ہمیں خدا کے آگے شرمندہ ہونا پڑے یا ہم سزا کے مستحق قرار پائیں۔ ہمیں دل سے یقین ہی نہیں ہے کہ ہمارے دلوں میں وہ سچے ایمان کی کیفیت ہی نہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا اور صاف ستھرا مسلمان مومن بنائیں۔

حدیث شریف میں ہے۔

" تم قیامت کے دن بدترین آدمی اس شخص کو پاؤ گے جو دنیا میں دو چہرے رکھتا تھا' کچھ لوگوں سے ایک چہرے سے ملتا تھا اور دوسرے لوگوں سے دوسرے چہرے کے ساتھ۔ "

(بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی)

یہ مسلمانوں میں موجود منافق ہی ہیں جنہوں نے جھوٹا لبادہ اوڑھ کر خود کو مسلمان ظاہر کیا ہوا ہے اور درحقیقت اسلام کو سب سے زیادہ نقصان ان نام نہاد مسلمانوں سے پہنچ رہا ہے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم سب لوگ تہیہ کریں کہ اپنی زندگی کے جس رخ میں بھی ہمیں دوغلا پن نظر آئے گا اس کو ہم خود صحیح کریں گے اور دوسروں کی بھی حوصلہ شکنی کریں گے ورنہ ہم منافق ہی کہلائیں اور منافق ہی سمجھے جائیں گے۔ اس دوہرے معیار اور منافقت کی زندگی نے آج مسلمانوں کو بدنام کر دیا ہے اور اسلام کے سنہری اصولوں پر دوسری قومیں عمل کر رہی ہیں اور اس کا ثمر بے پایاں ترقی اور خوشحالی کی صورت میں ان کو مل رہا ہے اور ہم مسلمان دن بدن پستیوں میں اترتے جا رہے ہیں۔ یہی وقت ہے اپنے آپ کو راہ راست اور سیدھی روش پر لانے کا صرف اسی صورت میں ہی ہم دین و دنیا میں سرخرو ہو سکیں گے۔

☆ _____ ☆

عجز وانکساری

آج کل کے حالات دیکھتے ہوئے ہر ذی ہوش انسان تشویش میں مبتلا ہے کہ جو بڑھتی ہوئی اخلاقی پستی ہم انسانوں میں دیکھ رہے ہیں شاید کچھ عرصہ پہلے ایسی صورتِ حال نہ تھی۔ آج کا انسان اپنی فتوحات اور ایجادات کے بل بوتے پر اس قدر نازاں ہے کہ فخر کرنے پر آئے تو غرور وتکبر کی آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ بعض مرتبہ تو اس کی چال، ڈھال، بات چیت سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ خدا ہی بن گیا ہے اپنے نیچے ماتحتوں کی فوج رکھ کر، روپے پیسے کے ڈھیر اور عیش وعشرت کے سامان نے خودنمائی اور خودستائی کا کچھ ایسا نشہ بھر دیا ہے کہ بعض لوگ کسی کو خاطر میں لانا تو دور کی بات بلکہ سیدھے منہ بات تک کرنا گوارہ نہیں کرتے۔ ایسا رویہ صرف امیروں اور رئیسوں میں ہی نہیں دکھائی دیتا بلکہ غور کیا جائے تو ہم میں سے ہر شخص چاہے امیر ہو یا غریب اپنے سے کم درجے کے بندے کو حقیر ہی جانتا ہے اور اپنی جان تک لڑا دیتا ہے کہ کسی طرح وہ اپنے سے بہتر درجے میں شامل ہو جائے۔

ذرا سوچئے! ہم میں سے کتنے انسان ایسے ہیں جو سچے دل سے دوسرے انسان کی عزت وتکریم صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ خدا کی مخلوق ہے۔ امیر ہے یا غریب، ذہین ہے یا کند ذہن، کسی اعلیٰ خاندان سے اس کا تعلق ہے یا سفید پوش گھر سے، کسی اعلیٰ پوسٹ پر فائز ہے یا معمولی حیثیت کی ملازمت کر رہا ہے، عزت کرنے کے لئے ہم عام طور پر انہی چیزوں پر دھیان دیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو انسان کی قدر اس کی اعلیٰ اقدار کی وجہ سے کریں۔ عام طور پر جو صورتِ حال دیکھنے میں آتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ اگر تو آپ کے مقابل ایسا شخص ہے جو مالی، معاشی، سماجی طور پر کسی طرح بھی آپ سے بہتر ہے تب تو آپ اس سے عزت و تعظیم سے پیش آئیں گے، اس کی بات کو توجہ سے سنیں گے اور مکمل تعاون کا یقین دلائیں گے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی غریب، نادار، مجبور آدمی اپنے کسی مسئلے کے حل کے لیے آپ کے پاس آتا ہے تو آپ کا رویہ قطعی مختلف ہوتا ہے۔ یہ غرور وتکبر نہیں تو اور کیا ہے؟

اسلام کا سب سے بڑا تحفہ انسانیت کے لیے یہی ہے کہ اسلام نے انسان کی عظمت کی بنیاد اس کے عمل وکردار اور اچھے اخلاق پر رکھی ہے نہ کہ مال ودولت، رتبہ، پیشہ اور خاندان پر۔

حضور ﷺ نے اپنے آخری خطبہ کے موقع پر ساری انسانیت کے لیے واضح الفاظ میں ارشاد فرمادیا ہے کہ

"کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں لال رنگت والا گوری

رنگت والے سے اور گورا لال رنگت والے سے افضل نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ "

قرآن میں ارشاد ہے:

" ۔۔۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں اور شیخی خوروں کو پسند نہیں کرتا۔ " (4: 36)

تکبر یا فخر و غرور کا مطلب یہی ہے کہ انسان اپنی کسی خوبی یا کسی خاص صفت یا اہلیت کی بنا پر اپنے آپ کو دوسروں سے افضل سمجھے اور یہ رویہ اس کے روزمرہ کے رویہ اور باتوں سے ظاہر ہو۔ بعض کو اپنی خوبصورتی پر ناز ہے تو بعض کو اپنی عقلمندی اور سمجھداری پر، کسی کو اپنی مالی حیثیت پر ناز ہے تو کسی کو اپنی اعلیٰ پوسٹ پر، جان، مال، ہمت اور طاقت صرف اسی کوشش میں صرف ہو رہی ہے کہ دولت کے اس کھیل میں اور نمود نمائش کی اس دوڑ میں کسی نہ کسی طرح دوسرے سے آگے نکل جائیں۔ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا کہ اپنی بڑائی دوسرے کے سامنے جتائی جائے اور دوسرے کو کم حیثیت ہونے پر ہلکی سی چوٹ لگا دی جائے۔ بعض مرتبہ تو فخر و غرور کا اظہار اس قدر لطیف انداز میں کیا جاتا ہے کہ زبان سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی اور صرف آنکھوں ہی آنکھوں سے طنز و تشنیع کے تیر چلا دیے جاتے ہیں کہ تم ہو کیا چیز۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آہستہ آہستہ دوسرے انسانوں میں احساس کمتری کے جذبات اُبھرنے لگتے ہیں۔ دوسرا انسان بھی تن من دھن سے اسی دُھن میں لگ جاتا ہے کہ کس طرح جائز و ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کرے تاکہ آئندہ کوئی اس کی تحقیر نہ کر سکے، کوئی اس کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچا سکے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا شخص اچھا یا برا ہر طرح کے ذرائع استعمال کر کے اپنی مالی حیثیت مستحکم کرتا ہے اور اثر و رسوخ بڑھاتا ہے۔ یہی رویہ معاشرے میں بے چینی، بے اطمینانی، سفارش، رشوت ستانی، چوری ڈکیتی، حق تلفی اور دوسری معاشرتی برائیوں کا رستہ کھولتا ہے کیونکہ انسان سب کچھ بھول سکتا ہے اپنی بے عزتی یا دوسرے کی نفرت و حقارت نہیں بھلا سکتا۔ یہ محرومیاں انسان کے اندر نفرت و غصے کے جذبات کو جنم دیتی ہیں جن کے بہت بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ فخر و غرور کی مذمت کی ہے۔

" اور زمین میں اکڑ کر (اور تن کر) مت چل کہ تو زمین کو پھاڑ تو نہیں ڈالے گا اور (نہ لمبا ہو کر) پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچ جائے گا۔ ان سب (عادتوں) کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک بہت ناپسند ہے۔ " (17: 37-38)

" اور ازراہ غرور لوگوں سے گال نہ پھلانا اور زمین میں اکڑ کر نہ چلنا کہ خدا کسی اترانے والے خود

پسند کو پسند نہیں کرتا اور اپنی چال میں اعتدال کئے رہنا اور (بولتے وقت) آواز نیچی رکھنا کیونکہ (اونچی آواز گدھوں کی سی ہے اور کچھ شک نہیں کہ) سب سے بری آواز گدھوں کی ہے۔ ''

(31: 18-19)

ہم میں سے ہر فرد کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے کہ ہم جو کچھ ہیں، جیسے بھی ہیں، جو بھی ہماری مالی یا سماجی یا معاشی حیثیت ہے وہ سب اللہ کی ہی جانب سے ہے۔ اگر ہم زندگی میں کوئی اہم مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تب بھی ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ ہم اللہ کے آگے عجز وانکساری سے کام لیں، دوسرے انسانوں کو بھی اپنے جیسا انسان سمجھیں، ان کے ساتھ محبت، نرمی، عزت اور احترام سے پیش آئیں۔ جہاں تک ممکن ہو دوسرے مصیبت زدہ بھائی کی مدد کریں تا کہ وہ بھی اپنی پریشانیوں اور مشکلوں میں سے نکل کر معاشرے کا کارآمد فرد ثابت ہو سکے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسی اچھے گھر میں بہت سارے وسائل کے ساتھ پیدا کر دیا ہے تو اس میں ہمارا اپنا کچھ ہاتھ نہیں۔ اس طرح ایک بچہ غریب گھرانے میں اللہ ہی کی مرضی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہماری بھلا کیا مجال ہے کہ ہم اپنے لیے خاندان یا ماں باپ کا انتخاب کر سکتے۔ تو ان سب باتوں پر غرور کرنا انتہائی درجے کی جہالت اور یہ رویہ قابلِ مذمت ہے۔ اسی طرح اگر اپنی محنت کے بل بوتے پر اگر ہم زندگی میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کر لیتے ہیں تو ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیئے کہ اگر اس میں خدا کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو یہ مقام کسی صورت میں حاصل نہ ہوتا۔ اس لیے انسان کو اپنی اوقات میں ہی رہنا چاہیئے۔ خواہ مخواہ کی ڈینگیں اور شیخیاں مارنے سے گریز کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے عاجز اور نرم مزاج بندوں سے بہت پیار ہے۔

'' اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔ '' (25: 63)

'' اور لوگوں سے گال نہ پھلانا اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنا بے شک اللہ کسی اترانے والے غرور کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ '' (31: 18)

عجز وانکساری کے لیے بہت ضروری ہے کہ انسان میں خیر وشر اور قناعت پیدا ہو۔ قناعت ایک ایسی طاقت ہے کہ جس کی بدولت انسان کسی کمی کو محسوس نہیں کرتا بلکہ جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے وہ اس میں خوش رہتا ہے اور لالچی نظروں اور چھوٹے دل سے اِدھر اُدھر نہیں دیکھتا۔ ہمارے ہاں آگہی نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اپنا چھوٹا پن اور اپنی کمزوریاں بڑی آسانی سے دوسروں کے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ انسانی نفسیات کے مطابق جب انسان کسی سے متاثر ہوتا ہے تو رشک وحسد میں مبتلا ہوتا ہے۔ متاثر ہونا تو ہماری فطرت کا حصہ ہے لیکن یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ ہم متاثر کس چیز سے ہو رہے ہیں، کسی کے زیادہ علم وعقل یا نیکی اور اچھائی سے متاثر ہو کر ہم بھی انہیں خوبیوں کو حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ جبکہ اگر ہم کسی کی کوٹھیوں، دولت، سٹائل، لباس اور دوسری دنیاوی اور ظاہری چیزوں سے متاثر ہوں گے تو

یقیناً دل میں محسوس تو کر سکتے ہیں کہ کاش یہ سب ہمارے پاس بھی ہو لیکن حاصل شاید نہیں کر سکتے۔ اس سے انسان میں بے بسی اور بے چینی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اگر یہ احساس شدت اختیار کر جائے تو یا تو انسان یہ سب حاصل کرنے کے لیے اس دوڑ میں شامل ہو جاتا ہے یا پھر حسد جیسی ذہنی بیماری کا شکار ہو کر اپنی مثبت سوچ اور صلاحیتوں کے صحیح استعمال سے بھٹک جاتا ہے اور پھر ان کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ

نہیں لیتے کچھ کام تدبیر سے وہ
سدا لڑتے رہتے ہیں تقدیر سے وہ

ایسے لوگوں کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

'' تا کہ جو چیز تمہارے ہاتھ نہیں لگی اس پر رنج نہ کرو اور جو چیز اس نے تمہیں عطا کی اس پر اتراؤ نہیں اور اللہ ہر اکڑنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ '' (57: 23)

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے نہ صرف محبت کرتا ہے بلکہ ہر انسان کو اُس نے بے شمار نعمتیں دیں ہیں۔ کسی کے پاس دولت زیادہ ہے تو کسی کے پاس علم، کسی کے پاس اولاد جیسی نعمت ہے اور کسی کے پاس شہرت یعنی اس نے سب انسانوں کو مختلف لیکن برابر کی چیزیں دیں ہیں۔ کسی کے پاس دولت کی کمی ہے اور جہاں دولت زیادہ ہے وہاں سکون کم ہوگا بہر حال اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق سے بلا امتیاز سلوک روا رکھے ہوئے ہے۔ لیکن ہمارے اردگرد کا ماحول ایسا بن چکا ہے کہ ہم جیسے ہی کسی دولت مند کو دیکھتے ہیں ہمیں وہ خوش قسمت اور خوش باش، خوش لباس نا جانے کیا کیا نظر آنے لگتا ہے اور ہم ایک غریب کو اس کے سامنے حقیر جاننے لگتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ غریب شاید اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب ہو۔ کیا اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہونا دنیا کے مال و دولت کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ یقیناً نہیں! کیا ہمیں ایسے انسان سے عزت و احترام کے ساتھ پیش نہیں آنا چاہیئے جو اللہ تعالیٰ کا دوست یا فرمانبردار ہو؟ لیکن دولت ایسی چیز ہے جو عقل و شعور پر پردہ ڈال دیتی ہے اور انسان اپنے آپ کو ہی خدا سمجھنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

'' اس طرح اللہ مہر کر دیتا ہے ہر تکبر کرنے والے جابر کے قلب پر۔ '' (40: 35)

تکبر شیطان کا طرزِ عمل ہے اور عجز و انکساری عظمت کی نشانی جیسا کہ قرآن پاک میں ہے کہ:

'' اور ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے آگے جھکو تو وہ جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا اور تکبر میں آ گیا اور وہ تھا ہی کافروں میں سے۔ '' (2: 34)

کیا ہم یہ پسند کریں گے کہ قیامت کے روز ہمیں شیطان کے ساتھی بنا کر پیش کیا جائے، یقیناً نہیں۔

☆ _____ ☆

ظلم کیا ہے؟

آج کل جب ہم اپنے اردگرد کے حالات کا بغور جائزہ لیں تو ہمیں یقیناً یہ احساس ہوگا کہ طرح طرح کے ظلم و زیادتیاں اور ناانصافیاں ہمارے معاشرے میں نا صرف ہو رہی ہیں بلکہ پنپ رہی ہیں اور دن بدن یہ ظلم وستم بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر روز بے شمار ظلم وستم ڈھائے جاتے ہیں۔ اپنے گھر والوں پر، اپنے اہل محلّہ پر اور رشتہ داروں پر، اپنے ملنے والوں اور ساتھ کام کرنے والوں پر لیکن بعض مرتبہ ہم خود بھی صحیح طرح سے واقف نہیں ہوتے کہ اصل میں ظلم ہے کیا۔

ظلم اصل میں زیادتی کا ہی شدید ترین روپ ہے۔ یعنی شروع میں کوئی غلط بات یا زیادتی جو ہم کسی کے ساتھ کر جاتے ہیں یہی غلط بات یا زیادتی یا ناانصافی اگر بار بار اور شدت سے کی جائے تو ظلم بن جاتا ہے۔ عام فہم زبان میں تو ظلم بہت برے معنوں میں لیا جاتا ہے اور کوئی بھی پسند نہیں کرتا کہ وہ ظلم کرے لیکن اصل صورت حال بالکل مختلف ہے۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ظلم کرنے سے مکمل طور پر پرہیز کر رہا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ظلم کے معنی سے صحیح طور پر واقف نہیں ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ظلم آخر کسے کہتے ہیں اور اس کی کتنی قسمیں ہیں۔

ظلم کی تین قسمیں ہیں۔ آیئے ان تینوں قسموں کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

1۔ بندے کا رب کے بارے میں ظلم

عام فہم زبان میں ظلم دنیاوی قسم کی زیادتیوں کو سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن کی اصلاح میں سب سے بڑا ظلم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

'' اور کافر لوگ ہی ظالم ہیں۔ '' (2: 253)

اسی طرح انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت ترک کر کے (یا اس کی عبادت کے ساتھ) غیر کی عبادت بھی کرنے لگے تو یہ شرک اور سب سے بڑا ظلم کہلاتا ہے۔ فرمایا

'' یقیناً شرک بڑا ظلم ہے۔ '' (31: 13)

2۔ ظلم کی دوسری قسم وہ ہے کہ انسان اللہ کی مخلوق پر ظلم کرے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ:

'' جس نے اپنے بھائی کی عزت کا یا کوئی اور حق دینا ہے تو وہ آج ہی اسے حلال کرا لے۔ اس سے پہلے کہ جب درہم و دینار نہیں ہونگے اور اس کے پاس نیک عمل ہونگے تو وہی بدلے میں لیے جائیں گے اور اگر نیکیاں بھی نہیں ہونگی تو حق دار کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے۔ ''

(صحیح بخاری)

مزید فرمایا کہ:

'' جس کسی نے اپنی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا حق مارلیا' اللہ اُس کے لیے جہنم واجب کردے گا۔ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ چاہے وہ معمولی حق ہو فرمایا پیلو کے درخت کی ایک ٹہنی ہی ہو۔ '' (صحیح مسلم)

ایک اور حدیث میں فرمایا:

''مومن اپنے دین میں بڑھتا ہی رہتا ہے جب تک کہ وہ کسی کو ناجائز قتل نہ کردے۔ ''

(صحیح بخاری)

3۔ ظلم کی تیسری قسم وہ ہے جب انسان اپنی ذات پر ظلم کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

'' اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔ '' (2: 58)

یعنی جب گناہ میں ملوث ہو کہ انسان تاریکی کو اپنے نفس میں جگہ دیتا ہے تو اللہ سے دوری کا مستحق کہلاتا ہے اور یہی اپنے اوپر ظلم ہے۔

ظلم چاہے کسی قسم کا ہو گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

'' اور تم میں سے جو بھی ظلم کرے گا ہم اُسے بڑا عذاب چکھائیں گے۔ '' (25: 19)

نبی پاک ﷺ نے بھی ربِ کائنات کا یہ حکم نقل فرمایا ہے کہ

''اے میرے بندو! میں نے اپنے نفس پر ظلم کو حرام کیا ہے اور تمہارے مابین بھی اسے حرام قرار دیا ہے۔'' (صحیح مسلم)

ایک اور جگہ فرمایا:

'' ظلم سے بچو' کیونکہ قیامت کے دن ظلم تاریکیوں کا باعث ہوگا۔ '' (صحیح مسلم)

پھر فرمایا:

'' اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا رہتا ہے اور پھر جب اُسے پکڑتا ہے تو پھر کوئی مہلت نہیں دیتا۔ ''

(مشکوٰۃ المصابیح)

اور پھر اس کے بعد وہ آیت تلاوت فرمائی جس کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

" اور ایسے ہی تیرے رب کی پکڑ ہے کہ جب وہ بستی کے ظالم باشندگان کو پکڑتا ہے تو اس کی گرفت سخت اور دردناک ہوتی ہے۔ " (11: 102)

ایک اور جگہ نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

" مظلوم کی بدعا سے بچ کیونکہ اس کے اور اللہ کے مابین کوئی حجاب نہیں ہے۔ " (صحیح مسلم)

دراصل ہم عام زبان میں ظلم کو بہت ہی جابرانہ رویہ سمجھتے ہیں اور اگر کسی کو ظالم کہا جائے تو وہ شخص بڑا جابر، بے رحم اور سنگدل سمجھا جائے گا۔ حالانکہ اوپر دی گئی وضاحت کے مطابق کوئی کوتاہی بھی جو اللہ کا حکم نہ مان کر کی جائے، دوسرے شخص کے ساتھ زیادتی کی جائے یا پھر انسان اپنے نفس کو خراب کرے تو وہ ظلم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کو صحیح یا غلط کی پہچان کرا دی گئی اور سب کاموں کو ٹھیک طرح سے انجام دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے واضح احکامات بھی دے دیئے۔ ہر وہ کام کرنے سے ہمیں روک دیا گیا جس سے کسی دوسرے کا یا ہمارا اپنا نقصان ہونے کا ڈر ہو تو اس سب کے باوجود اگر انسان نقصان ہی اٹھاتا رہے تو ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟

یعنی ظلم سے انسان کا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ چاہے وہ یہ ظلم خدا کی نافرمانی کی صورت میں ہو، کسی دوسرے کے ساتھ زیادتی ہو یا پھر اپنے آپ کو برائی کے اندھیروں میں گم کرنے کے مترادف ہو بہرحال ظلم ہی ہے۔

عام فہم زبان میں ظلم دراصل زیادتی کو کہتے ہیں اور آج ہم ظلم کی اسی قسم کا جائزہ لے گے۔ جو شخص کسی سے زیادتی کرتا ہے وہ ظالم ہے اور جس سے کوئی زیادتی کی جائے وہ مظلوم ہے۔ بعض مرتبہ ظلم و زیادتی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ہم بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ پتہ نہیں کب یہ ظلم و ستم ختم ہوگا۔ یہاں یہ بات یاد رکھیئے کہ اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اگر کسی ظالم کو اس کے ظلم کی سزا فوراً نہیں ملی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ عذاب الٰہی سے بچ گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے وہ جب چاہے ظالم کو اس کے کیے کی سزا دے۔ قرآن میں بڑے واضح الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

جیسا کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ظلم و زیادتی کی بہت سی صورتیں ہیں۔ آیئے انہیں دور کرنے کے لیے اپنے گھر سے بات شروع کرتے ہیں۔ کتنی ہی ناانصافیاں اور زیادتیاں جو انجانے میں ماں باپ اپنی اولاد سے کر جاتے ہیں یا آپس میں بہن بھائی کر جاتے ہیں۔ اکثر اوقات والدین اپنی اولاد میں سے کسی ایک یا دو کو دوسروں سے زیادہ وقت یا محبت دیتے ہیں اور صرف یہی نہیں بعض مرتبہ مالی معاملات میں بھی ان سے امتیازی سلوک رکھتے ہیں۔ والدین کا اپنے بعض بچوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا دوسرے بچوں پر ظلم ہے۔ والدین کو اپنے بچوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا دوسرے بچوں پر ظلم ہے۔ والدین کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کو ایک نظر سے دیکھیں۔ اپنی اولاد میں فرق رکھ کر شاید والدین کو یہ

احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ بچوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ان کے اس رویے سے ان میں جو شدید محرومیاں پیدا ہو جائیں گئیں اس سے نا صرف گھر میں بلکہ پورے معاشرے میں فساد پیدا ہوگا۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ بتاتے ہیں کہ میرے والد نے اپنے مال میں سے کچھ حصہ میرے نام حبہ (تحفہ یا ہدیہ) کیا۔اس پر میری ماں عمرہ بن رواح نے کہا میں اس پر راضی نہیں جب تک آپ نبی پاک ﷺ کو اس حبے پر گواہ نہ بنائیں۔میرے والد نبی پاک ﷺ نے خدمت میں چل پڑے تا کہ آپ ﷺ کو اس حبے پر گواہ بنائیں جو انہوں نے میرے نام کیا تھا۔نبی پاک ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تم نے ساری اولاد کو اسی طرح دیا ہے۔انہوں نے عرض کیا کہ نہیں۔اس پر نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

''خدا سے ڈرو اور اپنی اولاد میں انصاف کرو۔''

پس میرے والد واپس لوٹ آئے اور اپنا حبہ واپس لے لیا۔ (مسلم)

آج کل کی نام نہاد ترقی نے ہم سے ہماری اخلاقی قدریں چھین لی ہیں ہم اپنے اردگرد نظر تک ڈالنے کے روادار نہیں ہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور اصل میں کیا ہونا چاہیئے۔اپنے حقوق کے لیے تو ہم بہت باتیں کرتے ہیں اور اپنے سے کی ہوئی زیادتی ہمیں بہت چُبھتی ہے لیکن دوسروں کے معاملے میں ہم بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

ہم رشتہ داروں اور ہمسائیوں کے ساتھ بھی ظلم و زیادتی کا ہی سلوک روا رکھتے ہیں۔اگر ہم ایک تاجر اور کاروباری شخص کی حیثیت سے خود پر نظر ڈالیں تو کیا غیر معیاری مال مہیا کرنا ظلم نہیں؟ یہ چور بازاری' یہ ڈکیتی' یہ ذخیرہ اندوزی اور سمگلنگ ظلم ہی کے مختلف روپ ہیں۔کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں اس کا ہم پر کچھ حق ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حقوق بھی ہیں۔کیا ہم یہ سب حقوق ادا کر رہے ہیں؟ ہمارے لیے یہ لمحۂ فکر یہ ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر غور کریں اور دیکھیں کہیں ہم ہر لمحہ ظلم تو نہیں کر رہے۔ممکن ہے کہ جب ہم اپنا احتساب کریں گے تو یہ معلوم ہو شاید ہم خود بھی اس ظلم و ستم میں شریک ہیں۔ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ظالم کی بارے میں اللہ اور رسول ﷺ کے کیا احکامات ہیں۔یقیناً ہم میں سے کوئی نہیں چاہے گا کہ اس کو ظالم کہا جائے۔اس لیے ہم سب کو چاہیئے کہ حقیقی معنوں میں اچھے انسان بنیں۔چھوٹی سے چھوٹی زیادتی کرنے پر بھی خود کو فوراً ٹوکیں اور دل میں تہیہ کر لیں کہ آئندہ کسی دوسرے پر زیادتی یا ظلم نہیں کریں گے تا کہ ہم دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہو سکیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

'' مظلوم کی پکار سے بچو۔ '' (مشکوٰۃ المصابیح)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی بھی ذی روح پر اس قدر زیادتی یا ظلم نہ کر جائیں کہ وہ مجبور ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارے ظلم اور زیادتی کی شکایت کرے۔ ہمیں خدا سے ڈرنا چاہیئے کہ اگر وہ کسی پر عذاب نازل کرنے پر تل جائے تو اس کے عذاب سے اس شخص کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ اللہ ہمیشہ کمزور اور مظلوم کا ساتھ دیتا ہے ظالم کا نہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے ہمیں جو مظلوم کی پکار سے بچنے کا حکم دیا ہے تو اس میں خاص مصلحت و حکمت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

'' مظلوم کی پکار سے بچو کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا حق مانگتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ حقدار کے حق کو نہیں روکتا۔ '' (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت ابوذر غفاریؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

'' اے میرے بندو میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور پھر اسے تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا ہے۔ پس ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ '' (حدیثِ قدسی)

اصل میں بات یہ ہے کہ ہم میں سے بے شمار بلکہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اپنے رویے برتاؤ اور طرزِ زندگی کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہی نہیں کہ بے شمار چھوٹی چھوٹی زیادتیاں جو ہم روزانہ اپنے دوست احباب' ہمسائیوں' رشتہ داروں' والدین' اولاد یا شریک حیات سے کر جاتے ہیں وہ بھی درحقیقت ظلم کا ہی ایک رنگ ہیں۔ دوسروں سے سیدھے منہ بات نہ کرنا' کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا' حیثیت اور قدرت رکھتے ہوئے بھی قریبی رشتہ دار کی امداد نہ کرنا' مال و دولت یا پوزیشن والے کو زیادہ عزت و توقیر کے قابل سمجھنا اور کسی کو دنیاوی وسائل نہ ہوتے ہوئے حقیر جاننا' پیسے کا زیاں دولت کی نمود و نمائش' اپنے ماتحت یا کسی بھی شخص کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچانا' یقین جانئے یہ سب ظلم ہیں جو ہم کسی نہ کسی صورت میں کر ہی جاتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ یہ بھی ظلم ہیں۔ ظلم صرف قتل و غارت' مار کٹائی یا لوٹ مار کا ہی نام نہیں ہے۔ جس معاشرے میں ہر فرد اپنے اپنے حلقہ میں اور اپنے انداز میں ظلم و زیادتی کر رہا ہو اور خود بھی نہ جانتا ہو کہ اس کے اس رویے سے اجتماعی طور پر کس قدر تباہ کن اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ سوچئے کہ ایسے معاشرے کا کیا حال ہوگا۔ یقیناً وہی حال ہوگا جو ہمارا اس وقت ہو رہا ہے۔

کچھ لوگ ظالم ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ظالموں کا ساتھ دینے والے ہوتے ہیں۔ اگر سوچا جائے تو ظالم تو برا ہے ہی ظالم کا ساتھ دینے والے لوگ اس سے بھی زیادہ برے ہیں کیونکہ درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جن کی شہہ پر ظالم ظلم کرتا چلا جاتا ہے اور کچھ خوف خدا نہیں کرتا۔ اگر یہ لوگ ظالم کی بجائے مظلوم کا ساتھ دیں تو ظلم کبھی نہیں پنپ سکتا۔ اس

حوالے سے حدیث شریف میں آیا ہے کہ :

'' ظالم لوگ اوران کی مدد کرنے والے جہنمی ہیں۔ '' (ابوداؤد، ترمذی، احمد)

ایک اور حدیث میں ہے کہ :

'' اگر تم میں سے کوئی شخص کسی برائی کو ہوتے ہوئے دیکھے تو اس کو ہاتھ سے روکے۔ اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے۔ اگر اس قابل بھی نہ ہو تو کم از کم دل میں ہی اس کو برا سمجھے اور صرف دل میں اس کو برا جاننا کمزور ترین ایمان کی نشانی ہے۔ '' (مشکوٰۃ)

ہمارے سامنے کسی کا قتل ہو جاتا ہے یا کسی قسم کا ظلم ہو رہا ہوتا ہے لیکن اجتماعی طور پر ہم اس قدر کمزور اور بے حس ہو چکے ہیں کہ ہم میں اتنی اخلاقی جرأت اور خوف خدا بھی نہیں کہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آئے دن قتل و غارت ظلم و ستم کا بازار گرم رہتا ہے۔ لوگوں کی جان، مال اور عزت کو کوئی تحفظ نہیں اور پھر یہ ہم ہی لوگ ہیں جو شکوہ کرتے ہیں کہ معاشرے سے اخلاقی قدریں ختم ہو رہی ہیں، ظالم کا احتساب کرنے والا کوئی نہیں، یہ نہیں سوچتے کہ دراصل یہ ہم سب ہی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر بے شمار زیادتیاں کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان افرادی و اجتماعی زیادتیوں اور مظالم کے نتیجے میں معاشرے میں بدامنی، بے چینی، ذہنی انتشار، محرومیاں، نفرتیں پھیل رہی ہیں جو کہ آہستہ آہستہ ہمیں اپنی لپیٹ میں لے کر تباہی کی طرف لے جا رہی ہیں۔

ہم سب کو اپنا اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ کہیں جانے انجانے میں ہم کسی پر زیادتی یا ظلم تو نہیں کر رہے۔ صرف اسی طریقے سے ہم اپنی اصلاح کر سکتے ہیں اور ایک ایسا صحت مند معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں جس میں سب کو انصاف اور عزت ملے، محنت کا پھل ملے اور کسی کے ساتھ بھی ظلم و زیادتی نہ ہو۔

☆ ☆

سچ کی اہمیت

کہتے ہیں کہ ''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے''۔کبھی ہم نے یہ غور کیا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ جب کوئی جھوٹ بولتا ہے تو اس کی بنیاد ہی چونکہ غلط ہے اس لیے وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔جھوٹ بولنا اور غلط بات کرنا ایک رواج سا بن گیا ہے۔میاں بیوی کا رشتہ ہو یا والدین اور بچوں کا تعلق، نوکری ہو یا کاروبار ہمارے ہاں زیادہ لوگ جھوٹ کی بنیاد پر ان کو چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

روزمرہ زندگی کی مثال لے لیں تقریباً ہر گھر میں ایک بچہ ہر روز کئی جھوٹ سنتا ہے اور وہ بھی اسے زندگی گزارنے کا طریقہ بنا لیتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں ذرا سی غلط بیانی سے اگر سب کو فائدہ ہو سکتا ہے تو وہ کیوں نہ کرے۔ اُلٹا سچ بولنے پر اکثر اسے ڈانٹ بھی پڑ جاتی ہے۔مثلاً جب والدین کسی کے گھر مہمان بن کر جائیں یا کوئی مہمان گھر میں آئے تو اکثر ان کے سامنے کوئی نہ کوئی جھوٹ بول ہی دیتے ہیں اور بچہ اگر سچ بتانے کی کوشش کرے تو اسے بھی ڈانٹ کر چپ کرا دیں گے۔ باپ اپنے بچوں کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے یہ نہیں سوچتا کہ اس کے کردار کا کیا اثر پڑے گا؟ جب کہ فون پر اپنے بچے سے کسی سے یہ کہلوانا کہ میں گھر پر نہیں ہوں یا گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی یہ کہلوا دینا کہ ٹال دو۔ذرا سوچیں ان چھوٹی چھوٹی غلط بیانیوں سے بچے کی شخصیت پر کیا اثر پڑتا ہے اور پھر وہ اپنے والدین کی عزت کیسے کر سکتا ہے؟اسی طرح میاں بیوی کے رشتے میں بیوی اپنے شوہر کی عزت اس کے مال کمانے سے بھی زیادہ اس کے دیانتدار اور سچے ہونے کی وجہ سے کرے گی۔ہو سکتا ہے کہ تھوڑے عرصے کے لیے وہ پیسے کو بنیاد بنا ہی لے لیکن جوں جوں وقت گزرے گا اسے محسوس ہوگا کہ وہ انسان جو اسی کے لیے پیسہ کمانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے اور ہر معاملے میں جھوٹ کا ہی سہارا لے رہا ہے تو یقیناً یہ رشتہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔

اسی طرح سے اگر بیوی بھی جھوٹ بولے اور غلط بیانی کر کے اپنے شوہر کی نظر میں مقام بنانا چاہے تو یہ بنیاد جو کہ غلط ہے قائم نہیں رہ سکتی۔جھوٹ بولنے سے نہ صرف ہم دوسروں کی نظروں سے گر جاتے ہیں بلکہ اپنی نظر میں بھی چور بن جاتے ہیں۔مغربی ممالک کی عدالتوں میں بیان کے دوران جھوٹ پکڑنے کا آلہ بھی استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ وہ یہ بتا دیتا ہے کہ بولنے والا جھوٹا ہے کہ سچا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی انسان قانونِ قدرت کے خلاف کچھ بھی کرتا ہے تو اس کا نہ صرف جسم بلکہ اس کے جذبات بھی یہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص تذبذب کا شکار ہے۔یہ آلہ انسان کے بلڈ پریشر میں ردوبدل کو نوٹ کرتا ہے۔یعنی جب ہم جھوٹ بولتے ہیں تو پورے انسانی جسم میں ایک ہلچل مچ جاتی

ہے اور اس طرح یہ آلہ اسے پکڑ لیتا ہے۔ کیا ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ محسوس نہیں کرتے کہ یہ آلہ تو ضمیر کی صورت میں ہمیشہ ہمارے اندر رہتا ہے اور جہاں بھی کوئی غلط عمل ہو وہاں یہ ایک الارم کی طرح بج اٹھتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہماری اس دکھاوے اور جھوٹی زندگی کے شور شرابے میں اس کی آواز دب گئی ہے۔

آج ہمارے ہاں کاروبار اور نوکری سب جھوٹ کی بنیاد پر ہی چلتا ہے۔ کاروبار میں اپنے بنائے ہوئے مال کی برائیاں چھپا کر اسے اچھا بنا کر پیش کرنا بھی جھوٹ ہے۔ نوکری پیشہ لوگ کبھی بیوی بچوں کا بہانہ بنا کر، کبھی گاڑی کے پنکچر ہونے کا بہانہ یعنی بہانے کی آڑ میں جھوٹ بول کر دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جاتا کیونکہ جھوٹ بولتے ہوئے ان کا چہرہ ان کی آنکھیں گواہی دیتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں اور اکثر تو لوگ وہ کہہ کر ہی بھول جاتے ہیں اور دوبارہ پوچھنے پر اسی بات کو دوسرے ڈھنگ سے بتائیں گے۔ اس چیز سے ان کی کیا عزت رہ جاتی ہوگی؟ آخر کب تک آپ کسی کی نظروں میں دھول جھونک کر اور جھوٹ کا سہارا لے کر اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔

آخر ہم جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ آیئے اس کا جواب تلاش کرتے ہیں۔ بہت سی دوسری برائیوں کی طرح جھوٹ کی برائی بھی ہماری عام روزمرہ کی زندگی میں اس طرح شامل ہوگئی ہے کہ اب یہ برائی لگتی ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس جو شخص اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے وہ ہمارے معاشرے میں بیوقوف اور سیدھا سادھا سمجھا جاتا ہے اور دل سے چاہے لوگ اس کو اچھا ہی سمجھیں لیکن بظاہر عزت اس شخص کی کرتے ہیں جو تیز تر ار ہوں، جھوٹ موٹ گھڑ کے اپنا مطلب نکالنا جانتے ہوں۔ اس طرح بڑی تیزی سے ترقی کی طرف گامزن نظر آئیں اور 'سمارٹ' ہونے کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے دکھائی دیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی اپنے قصے خوب نمک مرچ لگا کر سنا رہا ہو تو محفل میں لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ دراصل لوگ اپنی محرومیوں کے باعث اس شخص کی بھڑکیں مارنے اور شیخیاں بکھارنے کی عادت سے اس لیے محظوظ ہو رہے ہوتے ہیں کہ وہ اس کی جگہ اپنے آپ کو دیکھتے ہیں۔ وہ یہ تو بھول جاتے ہیں کہ ان قصوں میں کچھ سچ بھی ہے کہ نہیں، جو یاد رہ جاتا ہے بس وہ یہ کہ اس کہانی کی لذت ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب بچوں کو جنوں اور پریوں کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں کیونکہ جب وہ کہانی سن رہے ہوتے ہیں اس وقت ان کے تصور میں وہی فلم بھی چل رہی ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو کہانی کا حصہ تصور کرتے ہیں۔ بالکل یہی حالت ناپختہ ذہنوں کی ہوتی ہے۔

لہٰذا جھوٹ ہونے کے باوجود اس طرح کی کہانیوں میں مزہ آتا ہے۔ جب تک تعریف کرنے والے لوگ ملتے رہیں گے جھوٹ کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔ ہمارے بچوں کی تربیت ڈراموں اور فلموں کے ذریعے کی جا رہی ہے نہ کہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ جیسے بزرگوں کی کہانیوں سے۔ جنہیں ان کی ماں نے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے کہا تھا

کہ جھوٹ نہیں بولنا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ جب حضرت عبدالقادر جیلانیؒ چھوٹے تھے تو ان کی والدہ نے انہیں علم حاصل کرنے کے لیے کسی عالم کے پاس بھیج دیا۔ جس قافلے کے ساتھ آپ روانہ ہوئے اسے قزاقوں نے لوٹ لیا جب تلاشی لی گئی تو کچھ نہ پا کر ڈاکوؤں کے سردار نے کہا کیا تمہارے پاس کچھ نہیں ہے تو جواب دیا میری ماں نے چالیس دینار قمیض کے اندر سی دیئے ہیں۔ ڈاکو ہنسے اور کہنے لگے کہ جھوٹ بول دیتے تو پیسے بچ جاتے تو جواب دیا کہ میری ماں نے چلتے وقت صرف ایک ہی بات کہی تھی کہ جھوٹ نہ بولنا ڈاکوؤں کا سردار سخت شرمندہ ہوا نہ صرف اس نے یہ کام چھوڑ دیا بلکہ مسلمان ہو گیا۔

ہم ایک مشکل دور سے گزر رہے ہیں جہاں سچ کی طاقت بہت کم محسوس ہوتی ہے لیکن یہی وقت ہے کہ سچ بولا جائے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا سب برا بھلا کہیں گے' لوگ محفلوں میں بلانا چھوڑ دیں گے۔ ہمارے ملک میں تو شاید رزق کے دروازے بند ہو جائیں یا شاید جان سے ہی ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔ تو کیا ہم جھوٹ کا لبادہ اوڑھے دل میں کُڑھتے رہیں گے یا پھر ٹیپو سلطان کے قول کے مطابق شیر کی طرح زندگی گزارنا چاہے گے ایک دن ہی کیوں نہ ہو اور اس ایک دن کی زندگی کو گیدڑ کی سو سالہ زندگی پر فوقیت دیں؟

ہم سچ بولنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ ہمارا ایمان کمزور ہے اور ہمیں اپنے اوپر اعتماد نہیں۔ کہتے تو ہیں کہ ''سانچ کو آنچ نہیں'' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کو ہم محض کہاوت سمجھ کر بھول جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ جو انسان سچ بولتا ہے اس کی کبھی بھی ہار نہیں ہوتی اور اس کو تو اللہ صلہ دیتا ہے۔ آپ خود سوچیں کہ آپ کا کوئی ملازم یا گھر کا کوئی ملازم یا گھر کا کوئی فرد چاہے کتنی ہی کڑوی بات ہو لیکن ہو کھری اور سچی بات تو برا تو ضرور لگے گا لیکن دل سے آپ اس کی عزت ضرور کریں گے اور اگر وہی ہمیں اچھا بتانے اور ہماری خوشنودی کے لیے جھوٹ بھی بول دے شاید اچھا تو لگے لیکن ہم مطمئن نہیں ہوں گے اور چاہتے ہوئے بھی اسے وہ مقام نہیں دے سکیں گے۔ سچ میں تو وہ طاقت ہے جو کہ انسان کو انسان ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

> '' اللہ فرمائے گا کہ آج وہ دن ہے راستبازوں کو ان کی سچائی ہی فائدہ دے گی۔ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ ابدالآباد ان میں بستے رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔ یہ بہت بڑی کامیابیاں ہیں۔'' (5: 199)

آنحضرت ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا' اس میں بہت سی برائیاں تھیں یعنی وہ شرابی' جواری اور کیا کچھ نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھ میں بہت سی برائیاں ہیں اور ایک دم ان کو چھوڑنا تو بے حد مشکل ہے لیکن ایک کچھ ایسا بتا دیں جس کو میں چھوڑ سکوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے تو صرف جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ اس نے کہا کہ یہ تو

آسان ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ دن گزرتے گئے وہ شخص جب بھی کوئی برا کام کرنے لگتا تو یہ سوچ کر رک جاتا کہ رسول اللہ ﷺ پوچھیں گے تو کیا جواب دوں گا؟ میں نے جھوٹ نہ بولنے کا وعدہ کیا ہے۔ تو ہوا یہ کہ آہستہ آہستہ اس نے تمام برائیاں چھوڑ دیں صرف ایک بری عادت چھوڑ کر یعنی جھوٹ بولنا۔ ویسے بھی جھوٹے پر خدا کی لعنت ہوتی ہے اسی لیے جھوٹے کا کوئی بھی کام ٹھیک سے نہیں ہو پاتا۔

جیسے کے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

'' بے شک اللہ اس شخص کو جو جھوٹا اور ناشکرا ہے ہدایت نہیں دیتا۔ '' (39: 3)

ہمیں بھی یہ احساس ہونا چاہیئے کہ ہم بھی اللہ کے سامنے جوابدہ ہیں۔ کیا اس ہستی کے سامنے ہم جھوٹ بول سکیں گے جو ہماری حقیقت کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ ویسے بھی اگر ہمیں یہ یقین ہے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے ہماری شہ رگ سے بھی قریب اور آخرت کے دن پر یقین ہے تو جھوٹ بولنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھ سکتا۔

قرآن پاک میں حکمِ خداوندی ہے کہ:

'' اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔ '' (9:199)

ہم روز بروز اس جھوٹی زندگی کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ بچوں کو دیکھ لیں والدین کی وہ کیا عزت کریں جن کا کام رشوت، سفارش اور دوسروں کا حق مار کر انہیں پالنا ہو اور ان کی ماں صحیح اور غلط اور سچ اور جھوٹ کی پہچان دینے کی بجائے صرف ظاہری شان و شوکت اور مادی زندگی کے بارے میں ہی سمجھا سکتی ہو تو وہ بچے پھر جیلوں میں جائیں گے، اپنے والدین سے ساری زندگی جھوٹ بولیں، چوری کریں جو بھی کریں ان پر کیا الزام ہے۔ ہاں انسان کو اختیار ضرور ہے کہ غلط پر صحیح کو چنے اور جھوٹ پر سچ کو فوقیت دے لیکن اس کے لیے تو غور و فکر کی ضرورت ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ بزنس چلانے کا ڈھنگ ضرور سکھایا جاتا ہے لیکن سچ کی بنیاد پر نہیں۔ نوکری حاصل کرنے کے لیے ہمارے معاشرے میں سفارش کا سہارا لیا جاتا ہے اور یہ سوچا نہیں جاتا کہ غلط طریقے سے حاصل کی گئی نوکری نبھانے کے لیے بھی بددیانتی کا سہارا لینا پڑے گا۔ ایک بیوی کو اس پر خوش ہونے کی بجائے کہ اس کا شوہر اپنے والدین سے جھوٹ بول کر اسے خوش کرنے کے لیے کچھ بھی کر رہا ہے، تو وہ یہ بھی جان لے کہ جو والدین سے جھوٹ بول کر اسے خوش کرنے کے لیے کچھ بھی کر رہا ہے اور اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے وہ تو کل کو کسی اور کو خوش کرنے کے لیے وہ اس کے ساتھ بھی جھوٹ بول سکتا ہے، کچھ بھی برا کر سکتا ہے۔ ہم نے اپنے رازق اسی دنیا میں بنا لیے ہیں اور ان کو خوش کرنے کے لیے ہر روز چاپلوسی کی صورت میں جھوٹ بولتے ہیں۔ چاہے انہیں سخت ناپسند بھی کرتے ہوں لیکن ان کی جھوٹی تعریفیں کرنے پر مجبور ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ غلط کام کرنے کو بھی تیار ہیں۔ یہ نہیں سوچتے

کہ وہ تو خود کسی کے محتاج ہیں اور وہ ہے اللہ کی ذات تو پھر ان کی محتاجی کے لیے ہم اپنا ایمان کیوں بیچ دیتے ہیں؟ سچ کی طاقت کو نہیں مانتے۔

ان سب حالات نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم جھوٹ کو ایک عام اور چھوٹی غلطی مان لیں یا جانتے ہوئے کہ فلاں شخص جھوٹ بولتا ہے ہم اسے اعتبار کے قابل سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

'' ایک مومن میں سب بُرائیاں ہوسکتی ہیں سوائے بددیانتی اور جھوٹ کے۔ '' (احمد)

صفوان بن سلیمؓ بیان کرتے ہیں نبی پاک ﷺ سے دریافت کیا کہ:

'' کیا ایماندار شخص طبعاً بزدل ہوسکتا ہے۔ فرمایا ہاں۔ پھر آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کیا ایماندار شخص بخیل ہوسکتا ہے۔ فرمایا ہاں۔ پھر آپ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ کیا ایماندار شخص طبعاً جھوٹ بولنے والا ہوسکتا ہے۔ فرمایا نہیں۔ '' (مالک، بیہقی)

سچ بولنا ایک ایسی صفت ہے جو اگر مسلمان کے کردار سے نکال دی جائے تو باقی سب خوبیاں بے کار ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہم ایسا ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ بچوں کا رشتہ کرتے ہوئے اگر لوگ یہ دیکھ لیں کہ لڑکا یا لڑکی جھوٹ کے عادی ہیں یا سچ کے تو وہ آنے والی ہزار تکلیفوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مہذب معاشرے میں اگر کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے تو اُسے بری طرح لعن طعن کی جاتی ہے۔ ملک کا سربراہ ہو یا ایک عام شہری جھوٹا انسان ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ جھوٹ انسان کی بدکرداری کی کسوٹی ہوتا ہے۔ ہم کس طرح اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ جھوٹ بول کر انسان نہ صرف دوسروں کو بلکہ سب سے بڑھ کر خود اپنے آپ کو احساسِ غلطی میں مبتلا کر دیتا ہے اور یہ احساس اس سے زندگی کی رونق، اپنی ذات پر اعتماد اور دل کا سکون چھین لیتا ہے۔ جھوٹ بول کر وہ اپنے دل پر بوجھ لیے رہتا ہے اور یہ بوجھ اتنا بھاری ہوتا ہے کہ باقی تمام خوشیاں کم وزن نظر آتی ہیں اور نتائج بہت بھیانک اور دل پر بوجھ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک سچا واقعہ پیش خدمت ہے۔

ایک خاندان میں باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں میں جائیداد کی تقسیم ہوئی، تقسیم کے وقت ایک بھائی ملک سے باہر تھا اور دوسرے بھائی نے ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اسے اس کے حق کے بارے میں جھوٹ بول کر ایک بھائی کو بے دخل کر دیا۔ اس بوجھ کو لیے ہوئے وہ انتہائی بیمار ہو گیا اور جب علاج سے فائدہ نہ ہوا تو اپنے روحانی علاج کے دوران اس نے بہت مشکل سے یہ بتایا کہ اس جھوٹ اور دھوکہ بازی کی قیمت اس نے دو (Retarded) بچوں کی صورت میں اور شادیوں کے بار بار ٹوٹنے کی شکل میں ادا کی اور اب اس کے پاس سوائے شرمندگی کے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کو اشارے دیتا رہا لیکن اس نے ایک جھوٹ کو چھپاتے ہوئے وہ سب کچھ کھو دیا جس کو پانے

کے لیے یہ دولت حاصل کی تھی۔یعنی اولاد کی خوشی وسکون۔ویسے بھی یہ جھوٹ کی زنجیر کبھی بھی ٹوٹتی نہیں مطلب یہ ہے کہ جب ایک دفعہ جھوٹ بولیں تو ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑیں گے اور پھر بھی بات وہیں کی وہیں رہ گئی جب بنیاد ہی مضبوط نہیں ہے تو عمارت نے آخر کار گرنا ہی تو ہے۔

اپنے ایمان کو مضبوط کریں اور سچ کی زندگی گزار کر دیکھیں تو اپنے آپ کو بہت بلندی پر اور طاقتور محسوس کریں گے۔سچ بولنے سے آپ کا ضمیر مطمئن رہتا ہے اور اللہ کی نظر میں ہی نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی سرخرو ہوتے ہیں۔اپنی ذہنی اور جسمانی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔اپنی نظر میں آپ گرتے نہیں اور دوسروں کے لیے مثال بھی بن سکتے ہیں اور آج واقعی ہمیں ایسے رول ماڈلز کی ضرورت ہے ورنہ اس جھوٹ کا زہر سب میں سرایت کر جائے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ:

'' اور جو شخص سچی بات لے کر آیا اور جس نے تصدیق کی وہی لوگ متقی ہیں۔ ''

(39: 34-35)

کیوں نہ ہم سب کل سے نہیں بلکہ آج سے ہی یہ طے کر لیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں غلط بیانی سے کام نہیں لیں گے اور نہ ہی اپنے جھوٹ کو (Justify) کرنے کی کوشش کریں گے۔کیونکہ جو غلط ہے سو غلط ہی ہے اور اس کے لیے کسی قسم کا نہ ہی بہانہ کرنا چاہیئے اور نہ ہی چل سکتا ہے۔کیونکہ آج جو سچ چھپا کر اور جھوٹ کا سہارا لے کر کوئی رشتہ بنانے جاتے ہیں یا نوکری حاصل کر لیتے ہیں یا پھر کاروبار چمکا لیتے ہیں تو ایسی کھوکھلی بنیاد پر قائم کوئی بھی رشتہ کتنی دیر چلے گا اور جب یہ ٹوٹے گا تو سکون وخوشی اور عزت بھی جائے گی۔

اور ہاں! رشتہ داروں، دوست احباب سے دوری ہو سکتی ہے لیکن اس کے عوض میں ایک نیک اولاد سکون وخوشی کی زندگی اور سب سے بڑھ کر خدا اور اپنی نظروں میں ایک خاص مقام مل جاتا ہے، پھر نہ کوئی ڈر رہتا ہے اور نہ ہی کوئی خوف بس ہر طرف کامیابی ہی کامیابی نظر آتی ہے۔

ایسے ہی ایک سچی کہانی ایک غریب آدمی کی ہے جو آلو کے چپس بنا کر بیچتا تھا لیکن باقی چپس بیچنے والوں سے مختلف تھا۔یعنی جو بھی برائی اس میں تھی بتا کر بیچتا تھا مثلاً کس تیل میں تلے گئے ہیں، تازہ ہیں یا نہیں۔بہت سے لوگوں نے اسے سمجھایا کہ تمہارے ساتھی بہت سے پیسے کما لیتے ہیں اور تم صرف اس سچ کو لے کر بیٹھے ہو۔لیکن اس نے سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ایک دن ایسا آیا کہ لوگوں نے اس کی دکان سے چپس خریدنا شروع کر دیئے کہ وہ سچی بات بتا دیتا ہے۔ تو خود ذرا غور کریں کہ کتنی طاقت ہے سچ بولنے میں! کیونکہ وہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔

سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم سب کو اس حقیقت کا پتہ ہے لیکن کرنے کو تیار نہیں۔تو وجہ یہ ہے کہ ہمارے ایمان

کمزور ہو چکے ہیں لہٰذا آج سے ہی اگر اپنا ایمان مضبوط کر لیں اور اگر یہ یقین ہے کہ اللہ موجود ہے اور ہر وقت ہمیں دیکھ رہا ہے تو پھر ہر لفظ، ہر قدم، ہر عمل پر اس کی موجودگی کا احساس رہے تو یقیناً غلطی نہیں ہو سکتی۔

☆ _____ ☆